دانی کی کہانی
دانی کی زبانی
ڈاکٹر احمد حسن دانی
کی داستانِ حیات

دانی کی کہانی

دانی کی زبانی

(داستانِ حیات)

ڈاکٹر احمد حسن دانی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

فہرست

تعارف

پروفیسر احمد حسن دانی کا نام تاریخ اور آثار قدیمہ کے شعبہ میں کس نے نہیں سنا۔ یہ ایک ایسی شخصیت ہے جس نے ایسے خشک شعبہ میں نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔ انہیں اپنے ملک کے علاوہ انگلینڈ' فرانس' جرمنی' اٹلی' تاجکستان' ہندوستان اور بنگلہ دیش نے مختلف اعزازات دیئے۔ انہوں نے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں اور کئی جرنل اور بے شمار مضمون لکھے۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد گھر والوں اور رشتہ داروں نے مل کر انہیں اپنی آپ بیتی لکھنے پر آمادہ کرلیا۔

پروفیسر دانی ہندوستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں بسنہ میں 20 جون 1920ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا پردادا کشمیری تاجر تھے جو کشمیر سے نکل کر ہندوستان کے وسط میں چھتیس گڑھ قصبہ میں آباد ہوگئے تھے۔ پورے خاندان میں دانی صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا جس میں وہ کامیاب ہوگئے۔ کامیابی بھی ایسی ہوئی کہ بنارس یونیورسٹی کا سب سے پہلا مسلمان طالبعلم ہونے کے علاوہ نہ صرف Top کیا بلکہ ریکارڈ قائم کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں محکمہ آثار قدیمہ میں ملازمت مل گئی۔ جب پاکستان بنا تو انہوں نے پاکستان آنے کے لیے اپنا نام دیا اور ان کو راجشاہی بھیج دیا گیا۔

پروفیسر دانی کی شادی 1949ء میں اپنے چچا کی بیٹی صفیہ سلطانہ سے ہوئی۔ ان کے چار بچے ہوئے۔ ایک بیٹی اور تین بیٹے۔ شادی کے بعد پروفیسر صاحب جہاں جہاں جاتے رہے اپنی بیگم کو ساتھ لے کر جاتے۔ خود وہ سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتے لیکن انہیں تسلی رہتی کہ گھر کی ذمہ داری بیگم نے لی ہوئی ہے۔ گھر کا سارا نظام انہوں نے اپنی بیگم کے حوالے کر رکھا تھا جنہوں نے بڑی اچھی طرح گھر چلایا اور ان کا ساتھ دیا۔

پروفیسر دانی کا زندگی گزارنے کا ایک اصول تھا ''وقت کی پابندی''۔ وہ اپنا ہر کام وقت پر کرتے اور ان کے کھانے پینے کا اور کام کرنے کا وقت مقرر تھا۔ اپنی محنت، ذہانت اور ایمانداری کی وجہ سے وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہونے کے باوجود ایک مشہور بین الاقوامی تاریخ دان اور ماہر آثار قدیمہ بنے۔ ان کا لکھنے کا انداز بہت اعلیٰ تھا اور جب تقریر کرتے تو چھوٹے بڑے سب کو محو کر لیتے تھے۔

پروفیسر دانی اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک قائداعظم یونیورسٹی میں کام کرتے رہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو کہتے تھے کہ تم لوگ بھی محنت کرو اور تجسس، تلاش اور تحقیق سے کام لو تو بہت ترقی کر سکو گے۔ ان کا کہنا تھا کہ علمی تحقیق کے بغیر کوئی بھی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کا ایک خواب تھا کہ پاکستان کا نام پوری دنیا میں روشن ہو۔ پاکستان مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ملک بنا ہے جہاں پر نوجوان مسلمان کو کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ وہ ترقی کے راستے پر آسانی سے گامزن ہو سکتے ہیں۔ ان کی طرح ہر موڑ پر رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اس خواب کو لے کر وہ 26 جنوری 2009ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب یہ نوجوانوں پر ہے کہ وہ ان کے خواب کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔

O------O------O
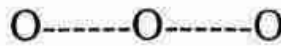
بابِ اوّل

آبائی وطن اور میرا بچپن

کشمیر اور کشمیری خاندانی لقب

میرا آبائی وطن کشمیر ہے جہاں میرے آباؤ اجداد دوسرے کشمیریوں کی طرح سینکڑوں برسوں سے بودوباش کرتے آ رہے ہیں۔ کشمیر کے جغرافیہ کا ذکر قدیم زمانے سے ہی پرانی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ان سب کو یکجا کر کے سر آرل سٹائین نے اپنی کتاب ''کشمیر کا قدیم جغرافیہ'' (Ancient Geography of Kashmir) مرتب کی ہے۔اس سے بہتر کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔اس میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ لفظ کشمیر (Kashmir) اسی تلفظ کے ساتھ دو ہزار تین سو سال پرانا ہے۔ یہ لفظ کشیر (Kashir) اور کشویر سے بدلتے ہوئے اسی شکل میں سامنے آیا ہے۔ اس کا کوئی تعلق سنسکرت روایت میں دیئے ہوئے کشیپ پور سے نہیں ہے۔ دراصل اس لفظ کا اصلی معنی بتانا مشکل ہے۔لوگوں نے بہت سی قیاس آرائیاں کی ہیں لیکن یہ صرف قیاس کی حد تک ٹھیک ہے۔

وادیٔ کشمیر کا قدرتی خلاصہ سب سے پہلے نیل مت پرانا میں پایا جاتا ہے۔ یہ کتاب اندازاً چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے درمیان میں مرتب کی گئی تھی۔اس میں زیادہ تر نیل یعنی ناگ' سانپ اور نیل دیوی یعنی وشنو کی پوجا کا بیان کیا گیا ہے۔اس کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ کشمیر ایک بہت بڑی جھیل تھی اور اس کو چاروں طرف سے اونچے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔اس جھیل کا نام ''ستی سر'' (Sati Sar) بتایا جاتا ہے۔ایسا کہا جاتا ہے کہ جب پانی سوکھنے

لگا اور زمین ابھرنے لگی تو ہندو دیوتا وشنو نے اُس جگہ سب سے پہلے ہل چلایا۔ جہاں سب ندی نالے جمع ہو کر ایک دریا کی شکل میں بہتے ہیں۔ اس جگہ کا نام نیل ناگ تھا جو بعد میں ورناگ یا ویری ناگ میں بدل گیا۔ یہیں سے دریا جہلم (قدیم نام وتستہ) کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دریا سب پانی کو جمع کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے راستے سے وادی سے باہر نکلتا ہے۔ اس جگہ (gorge) (گلا) کا نام وراہ مول موجودہ نام (بارامُلا) ہے۔ وراہ سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی شیو ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ہندو دیوتا شیو کے وراہ اوتار سے ہے۔ یہ تو ہوا ہندو برہمنوں کا قصہ جس میں انہوں نے کشمیر کی قدرتی حرکات کو اپنے خیال کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

درحقیقت وادیٔ کشمیر پیالہ نما ہے۔ اس کے اندرونی حصہ میں کشمیری قوم بستی چلی آرہی ہے۔ سرزمین کشمیر کے لوگ یہاں کی زرخیز زمین سے فصل اُگا کر اپنی گزراوقات کرتے آرہے ہیں۔ دریائے جہلم یہاں ریڑھ کی ہڈی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ اسی لیے ساری روایات اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس وادی کی باہری دیواریں اونچے اونچے پہاڑ ہیں جو ایک لگاتار گول دائرہ بناتے ہیں۔ یہ دیواریں وادی کی حفاظت کرتی ہیں اور حملہ آوروں کو دور رکھتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ وادی کے اندر رہنے والوں کو باہر کی دنیا سے بالکل جدا بھی کرتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں کشمیری تاریخ اور ثقافت اپنے اندر ہی سمٹ کر رہتی چلی آئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ باہر کے پہاڑوں میں دیگر اقوام بھی بستے چلے آئے ہیں اور انہیں پہاڑوں میں سے گزرگاہیں بھی کھلتی ہیں۔ انہیں کے ذریعے باہر سے تعلق رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وادی کی زرخیزی اور قدرتی خوبصورتی اور ان سے زیادہ وادی کے رہائشی آرام گاہوں کی وجہ سے پہاڑی لوگوں میں اور یہاں کے باشندوں میں ہمیشہ کشمکش رہی ہے۔ جب بھی وادی میں ایک مضبوط حکومت برسراقتدار آئی دونوں حصے اندرون وادی اور باہری پہاڑی علاقے (Rim) جڑے رہے اور ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے رہے۔ لیکن پھر بھی کشمیر کی اپنی فضا علیحدہ قائم رہی۔ کشمیر کی اپنی ثقافت اور زبان نے وادی میں آریاؤں کے آکر آباد ہونے کے بعد ہی جنم لیا اور یہیں پنپیں۔

سر جارج گری ارسن نے کشمیری کو لسانی اعتبار سے دردزبانوں میں شامل کیا ہے۔ یہ زبانیں کشمیر کے علاوہ شمالی علاقہ جات چترال اور سرحد میں بولی جاتی ہیں۔ یہ ساری وہ آریائی زبانیں

ہیں جو کلاسیکی سنسکرت سے ہٹ کر اپنی یکتائی بنائے رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے ان کے بولنے والے بھی اُن آریائی قوم سے مختلف ہیں۔ ان پرانے رہنے والوں کو ہم آدم نواس (قدیم ترین انسان) کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ کشمیری زبان کلاسیکی سنسکرت سے مختلف رہی ہے۔ اسے پشاچی گروہ میں شامل کیا جاتا ہے کیونکہ اس زبان کے قواعد وضوابط دوسری آریائی زبان کے Synthic group مرکب الفاظ سے ملتے جلتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر یہاں سنسکرت کا اتنا رواج کب اور کیسے ہوا؟ عام لوگوں کا خیال ہے کہ بعد میں قدیم زمانے میں ہی ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے برہمن یہاں وارد ہوئے اور سنسکرت کو فروغ دیا۔ یہ خیال صرف قیاس پر مبنی ہے۔ تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگر ہم نسلیات (Ethnology) پر غور کریں تو یہ ہمیں قبول کرنا پڑے گا کہ کشمیری ہندوؤں میں برہمنوں کی تعداد کثرت سے پائی جاتی ہے۔ یہ برہمن غیر کشمیری نہیں معلوم ہوتے کیونکہ ان کے رسم ورواج اور کنیات ہندوستان کے برہمنوں سے الگ تھلگ ہیں لیکن یہ برہمن کیوں کہلاتے ہیں اور ان پر سنسکرت کا اثر کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ سوال غور طلب ہے۔

شمالی علاقہ جات میں اس قسم کے برہمنوں کا کوئی وجود نہیں ملتا اور نہ ہی وہاں کی زبانوں پر سنسکرت کا اثر پایا جاتا ہے۔ البتہ آٹھویں صدی عیسوی اور اس سے ذرا پہلے وہاں کے کتبوں میں نووارد برہمنوں کا نام پایا جاتا ہے۔ اگر ہم حال میں دریافت شدہ آثاریات کے شواہد کو مدنظر رکھیں تو بات تھوڑی سی آسان ہو جاتی ہے۔ کشمیر کے برزہوم کے علاقے میں جو کھدائی ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہاں کا حجری دور کا زمانہ، ٹیکسلا اور سوات کے اسی ثقافتی ورثہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ برزہوم کے بعد والی تہہ میں ایسے رنگین ظروف دریافت ہوئے ہیں جو ٹیکسلا سے ہی وہاں پہنچے ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک پتھر ملا ہے جس پر کندہ تصاویر کا تعلق چلاس کی چٹانوں پر کندہ تصویروں سے ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان علاقوں کی ثقافتیں ایک دوسرے سے منسلک رہی ہیں۔

اس کے بعد کے زمانے میں سوات، دیر، بجوڑ، چترال وغیرہ کے علاقوں میں بہت سی قبریں ملی ہیں۔ اس کا نام میں نے غلطی سے گندھارا قبروں کی ثقافت رکھا۔ دراصل یہ دریاؤں کے وارد

ہونے کے بعد کی ثقافت ہے۔ یہ آریائی قبیلے کون تھے۔اس پر اختلاف ہے۔ پروفیسر جی تو چی ان کو دردقوم سے وابستہ کرتے ہیں لیکن اس ثقافت کی چیزیں ٹیکسلا میں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ کشمیر میں ابھی تک ایسی کوئی قبر نہیں ملی لیکن اس کے ظروف وہاں پائے جاتے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر میں آریائی قوم اسی زمانے میں اور اسی راستہ وارد ہوئی۔اگر یہ درست ہے تو کشمیر میں آریاؤں کے وارد ہونے کا زمانہ اور طریقہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بالکل علیحدہ ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہاں کے آریوں نے اپنا سماجی طریقہ کار یہاں پہنچ کر مختلف ڈھنگ سے مرتب کیا ہو۔اس طریقہ کار میں ہندوستان میں پائے جانے والے ذات پات کے رواج کی کوئی گنجائش نہیں۔البتہ آریائی اور غیر آریائی اقوام میں فرق ضرور رہا ہوگا۔آریائی قوم حملہ آور تھی۔حکمران بنی اور اونچے درجے میں شمار کی جانے لگی جبکہ غیر آریائی محکوم رہا اور نیچے درجہ میں دھکیل دیا گیا۔

اگر یہ درست ہے تو یہاں برہمنوں کا اور ذات پات کا ذکر کیوں کیا جاتا ہے۔میرے خیال میں برہمن کا تصور یہاں بعد میں آیا جب ویدوں کے خیالات اور کلاسیکی سنسکرت کے اثر نے یہاں زور پکڑا۔اس کا ٹیکسلا سے آنا کوئی مشکل نہیں تھا کیونکہ پہلے بھی اس شہر کے تعلقات کشمیر کے ساتھ تھے۔اس کے علاوہ ٹیکسلا اور کشمیر دونوں جگہ ناگ کی پوجا قبل آریائی دور میں پائی جاتی ہے۔تو پھر آریائی دور میں ایک دوسرے پر اثر کیوں نہ ہوا۔اس طرح کشمیری آریائی قوم کو اپنے آپ کو برہمن کہلانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے تھا۔جن عالموں نے کشمیری سماج کے متعلق لکھا ہے اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہندوؤں میں صرف دو ہی طبقے ہیں۔ایک برہمنوں کا اور دوسری نچلی قوم کا۔دوسری قوم میں ڈوم' باتل' بھانڈ' ہانزی' ڈانگر وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔اب سوال اٹھتا ہے کہ ذات پات کا تصور یہاں کیسے ہوا۔اگر ہم اس کا تفصیل سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ یہاں اس قسم کی چار ذاتیں نہیں ملتیں جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے فریڈرک ڈور Fredrik Dore نے اپنی کتاب ''جموں اور کشمیر کی ریاستیں'' (Jammu and Kashmir Territories) میں ذات پات اور ذیلی ذاتوں

(Sub-Castes) کا ذکر کیا ہے، لیکن تفصیل سے پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی دراصل دو قوموں کا ذکر کررہا ہے۔ایک آریائی برہمن اور دوسرا نچلی قوم۔ جب وہ مسلمانوں کا ذکر کرتا ہے تو ان میں ذیلی ذاتوں (Cast Sub divisions) کا بیان کرتا ہے۔ کیا مسلمانوں میں ذات پات ہے۔اس کا خلاصہ آگے دیا جائے گا۔ بہرحال یہ الفاظ انگریز استعمال کر گئے اور اس کے بعد آنے والے مورخ بغیر سوچے سمجھے اس کی نقل کرتے گئے۔اس کی بڑی مثال ہمیں کشمیر گزیٹر میں اور محمد الدین فوق صاحب کی ''تواریخ اقوام کشمیر'' میں ملتا ہے۔آخرالذکر کتاب کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیری مسلمانوں میں بہت ساری اقوام شامل ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔اگر کشمیریوں میں شروع سے ہی دو قومیں چلی آرہی ہیں تو پھر اتنے سارے اقوام کہاں سے آگئے۔ان غلطیوں کو پہچاننا مشکل نہیں۔سب سے پہلے انہوں نے اس میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جس میں مسلم حکمران وسطِ ایشیاء سے یہاں وارد ہوئے۔ مثلاً سادات، بخاری، قریشی، اندرابی وغیرہ۔اس کے علاوہ چین سے آئے ہوئے لوگ مثلاً ختعیٔ، کاشغری، یارقندی وغیرہ اور افغان، مغل، لداخی اور جموں اور پنجاب کے بہت سارے لوگ جس میں ڈوگرے اور راجپوت بھی شامل ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ کشمیر میں کئی صدیوں سے رہتے چلے آرہے ہیں اور ان کے ساتھ کشمیری مسلمانوں نے شادی بیاہ بھی کیا ہے۔لیکن انہیں شروع کی کشمیری قوم میں شامل کرنا تاریخ کے خلاف ہے۔اسی طرح ایئر مارشل اصغر خاں کے خاندان والوں کو لے لیں جو دراصل آفریدی ہیں لیکن سو سال سے کچھ زیادہ کشمیر میں رہتے چلے آرہے ہیں۔اگر ان سب کو کشمیریوں میں شمار کیا جائے تو پھر لفظ اقوام درست ہے لیکن اس میں لون، دار، پنڈت، کول، وائیں، پاورتی، متو، ریشی اور بٹ وغیرہ سب کو الگ قوم بتایا گیا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔کبھی ان کے لیے ذات کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ یہ نہ مختلف اقوام سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ذاتوں سے۔ یہ سارے کے سارے ایک کشمیری قوم سے ہی نکلتے ہیں۔ان میں بہت سارے نام پیشاوری ہیں۔ کچھ خاندانی اور کچھ صفاتی ہیں۔ان باتوں کا ذکر بھی فوق صاحب کرتے ہیں۔اس کے باوجود وہ ڈار کو ڈامر راجپوت سے اور ڈانگر سے جوڑتے ہیں۔ڈامر کے متعلق سر آرل سٹائین نے تفصیل سے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب کلھن کی لکھی ہوئی راج ترنگنی کا ترجمہ ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ ڈامر زراعت پیشہ لوگ تھے۔ان کا راجپوت سے کوئی تعلق نہیں۔دراصل راجپوت کشمیر میں نہیں پائے جاتے سوائے ان لوگوں کے جو پہاڑی علاقوں اور پنجاب سے یہاں وارد ہوئے ہیں۔ پہاڑی علاقہ کے لوگ زیادہ تر راجہ کہلاتے ہیں' راجپوت نہیں۔اسی طرح ڈوگر جموں کے رہنے والے ہیں۔ان کا تعلق راجپوتوں سے کوئی خاص نہیں۔ہاں البتہ کلھن نے بھی اپنی کتاب میں راجپوتوں کا ذکر کیا ہے جنہیں کشمیر کے راجا باہر سے لاکر اپنی فوج میں بھرتی کرتے تھے۔یہ حقیقتاً کشمیری قوم میں شامل نہیں کیے جاسکتے۔ڈامر لوگ کبھی کبھی اتنے زور آور ہوجاتے ہیں کہ یہاں کے راجاؤں کو پریشان کرتے تھے۔شاید اس زور آوری کی وجہ سے فوق صاحب نے انہیں راجپوت یا کھتری کا درجہ دیا ہو۔ بہرحال یہ درست نہیں۔ سر آرل سٹائین نے ڈامر کو تولید (Lavanya) نسل سے جوڑا ہے اور اسی سے لون لوگوں کا وجود میں آنا تصور کیا گیا ہے۔ یہ شاید اس لیے کیا گیا کہ کلھن کے مطابق تولید بھی زراعت پیشہ تھے۔ میرے خیال میں نہ تولید اور نہ ڈامر کوئی غیر آریائی نسل ہے۔ جیسے سر آرل سٹائین نے خود لکھا ہے کہ دار برہمنوں میں ہی گنے جاتے ہیں۔اسی طرح لون اور ڈامر کو بھی آریوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔

اب رہا سوال حملہ آواروں کا اور بعد کے نو وارد قوموں کا جو صدیوں سے یہاں چلے آتے رہے ہیں۔مثال کے طور پر یونانی ناسک' کشان' ہون' ترک' منگول اور چغتائی وغیرہ۔ یہ قومیں یا تو یہاں کے لوگوں میں مدغم ہوگئیں یا کچھ لوگوں نے اپنی علیحدگی بنائے رکھی اور اپنے آپ کو مرزا' بیگ' مغل وغیرہ نام سے پہچانتی۔ان میں سے ایک نام شیخ بھی ہے جو دراصل درویشوں سے مناسبت رکھتا ہے لیکن کشمیریوں کے بہت سارے لوگ جن میں نچلی قوم کے بھی لوگ شامل ہیں۔ درویشوں کے ہاتھوں اسلام سے مشرف ہوئے۔ان کی عزت افزائی کے لیے انہیں بھی شیخ[1] کا لقب دیا گیا۔لیکن ان میں وہ برہمن لوگ زیادہ تر شامل نہیں ہوئے جو مسلمان ہوئے۔اسی وجہ سے ان لوگوں نے اپنی برہمن کنیت برقرار رکھی۔

یہ کنیت ہندو برہمن اور برہمن سے اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔مثلاً پنڈت پٹ یا بھٹ دار یا دھر۔ بانڈے یا پانڈے۔وائیں اور وانی یا ونک اور

(1) ایک خیال یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ "شیخ" کہلائے۔یہ Converted کی پہچان تھی)

وانن (دھونین) (Vaninov Dhvanion) کول سپرو وغیرہ۔ فوق صاحب نے برہمنوں کے گوتر کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل گوتر پرور منجری (Gotra Pravor manjari) کتاب میں پائی جاتی ہے۔ اس کا ذکر کئی پرانی کتابوں میں بھی ہوتا ہے۔ زیادہ تر ان برہمنوں کے متعلق جانکاری حاصل ہوتی ہے، جو اگر ہاری برہمن ہوتے ہیں۔ یعنی وہ برہمن جن کو راجاؤں نے زمینیں دان میں دے کر آباد کیے ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے برہمنوں کا گوتر نہیں ہوتا۔ گوتر دراصل کسی خاندان کے بانی کے نام سے ہوتا ہے اور پرور[1] اُسی خاندان کے تین یا چار ایسے نامور اشخاص پر مبنی ہوتا ہے جنہوں نے قدیم زمانے میں کافی شہرت حاصل کی ہو۔ اتنی تفصیلی یاد بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ خاص طور سے جو برہمن مسلمان ہو گئے ہیں۔ انہیں یاد رکھنے کی اب ضرورت ہی نہیں۔ اس کے باوجود فوق صاحب نے منٹو خاندان کے لوگوں کو سارسوت گوتر سے منسوب کیا ہے۔ اس میں کتنی سچائی ہے کہنا مشکل ہے۔ لیکن جو بھی کنیات کشمیری مسلمانوں میں ابھی تک باقی ہیں وہ نہ مختلف قوموں کا نہ مختلف ذاتوں کا اشارہ کرتی ہیں یہ صرف خاندانی لقب ہیں جن کا آغاز کئی طریقوں سے ہوتا رہا ہے۔ اس میں ذات پات کا کوئی دخل نہیں۔ اس لیے وائیں یا وانی خاندان کو ویشیر ذات سے نہیں جوڑا جا سکتا۔

کشمیر اور شمالی پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں اور بہت سے لقب قدیم زمانے سے استعمال ہوتے آ رہے ہیں۔ ان کی پوری فہرست سر ڈنزل ایبسٹن، سر ایڈورڈ ڈکلاگن اور ایچ اے روز کی کتاب "A Glossary of the Tribes and Castes of the Punjab and north west Frontier Province" میں ملے گی۔ اس کتاب میں سب سے قدیم نام راجا کا ہے۔ جو یونانی راجاؤں کے سکوں سے لے کر کشان راجاؤں کے سکوں میں جلی پایا جاتا ہے۔ اس سے بھی پہلے سن سنسکرت کتابوں میں ملتا ہے۔ جب ان راجاؤں کی حکومت بٹتی گئی اور کمزور ہونے لگی تو چھوٹی چھوٹی ریاستیں آزاد ہو کر پہاڑی علاقوں میں رہ گئیں اور یہ اپنے آپ کو راجا کہلانے لگے۔ مثال کے طور پر گکھڑ یا گڈ کھر اور چبھ وغیرہ اسی کی بگڑی ہوئی شکل رانا ہے۔ جب یہ وادیٔ کشمیر میں پہنچے تو اپنا لقب ساتھ لیتے گئے۔ اس کے برعکس لفظ راجپوت کا ہے۔ جو

(1) اس لفظ کے معنی آگے بتائے گئے ہیں۔ "پریوار"

دراصل راجستھان کے رتبے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لفظ بہت بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ اس کا آغاز ہون راجاؤں سے پہلے یعنی پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی سے قبل نہیں ملتا۔ ہونوں کے ساتھ بہت سے قبیلے وسط ایشیاء سے ہمارے ملک میں پہنچے۔ مثال کے طور پر گوجر، جاٹ، کھوکھر، جنجوآ وغیرہ۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ قبیلے پہلے اور کچھ بعد میں آئے ہوں لیکن ہونوں نے یہاں آ کر ایک ایسا زراعتی سیاسی نظام رائج کیا جو طریقہ (Feudalism) جاگیرداری کے بہت قریب تھا۔ اس میں بڑے سارے درجے ہوتے ہیں لیکن سب کے سب ایک ہی (Order) ترتیب میں جڑے ہوتے ہیں جن کا سب سے اعلیٰ عہدیدار اس وقت کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ان مختلف درجات کے اہلکاروں کو راجپوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب ایک بادشاہت ختم ہوگئی تو سارے زمینداروں نے اپنے آپ کو راجپوت کہلوا کر طاقت خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ زیادہ تر آپ کو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے سے لے کر راجستھان تک پھیلے ہوئے نظر آئیں گے۔ کبھی کبھی ڈوگرے اور شملہ پہاڑی کے راجے بھی اپنے آپ کو راجپوت کے لقب سے نوازتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک راٹھور ہیں جو شاید مغل دور میں وادیٔ کشمیر میں پہنچے۔ ان کے علاوہ عربی لقب میر یعنی امیر اور ملک وغیرہ بھی وادیٔ کشمیر میں وسط ایشیا سے مسلمانوں کے دور میں پہنچے اور بہت سے مقامی حکمرانی لقب بھی رائج ہوئے۔ ہندو راجاؤں کے زمانے میں راجپوت اور مسلم دور میں کارکن۔ انہیں میں سے زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں کو سپرو کہا جاتا ہے۔ اسی میں رینہ، بخشی وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے جدارشی ہیں۔ جو دراصل درویشوں کی ایک جماعت ہے اور صرف کشمیر وادی میں پائی جاتی ہے۔ یہ لفظ وید میں عام استعمال ہوا ہے۔ یہ وہ ماہر القدر خاندان کے لوگ ہیں جنہوں نے وید کی آواز کو سنا اور عام لوگوں تک پہنچایا۔ اسی وجہ سے وید الہامی کتاب مانی جاتی ہے۔

کشمیر میں بہت دیر تک بدھ (بودھ) مت کا دبدبہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے چین سے بہت سے بودھ سیاح یہاں آتے رہے ہیں۔ کشمیری بودھوں نے چین کے بودھوں کو کافی متاثر کیا ہے۔ جب ہون راجاؤں کی سرپرستی کشمیر پر ہوئی تو معاملہ کچھ بدلنے لگا۔ ہونے خود سورج دیو (دیوتا) کی پرستش کیا کرتے تھے۔

اس کا عالیشان نمونہ اننت ناگ یعنی اسلام آباد میں مندر کے کھنڈرات کی شکل میں موجود ہے۔ان کا ایک زبردست راجا مہر کل متا جو شِو دیو کا پجاری تھا۔اس کے بعد سے شِو کا چرچہ یہاں بڑھنے لگا اور بودھ مت زوال پذیر ہوا۔آٹھوی صدی عیسوی میں جنوبی ہندوستان سے شنکراچاریہ کے مبلغوں نے یہاں حد سے زیادہ شِو کی تبلیغ کی۔بودھ مت کا قریب قریب خاتمہ ہوا۔دوبارہ برہمنوں کا بول بالا ہوا۔اس وقت کی دھندلی یاد آج بھی کشمیری برہمنوں کی روائت میں موجود ہے۔شاید اسی دوران برہمنوں نے اپنا گوتر استوار کرنا بہتر سمجھا۔یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اب یہاں ایک نئی مقامی آزاد سلطنت کی بنیاد کرکوٹ راجاؤں نے ڈالی۔ ان کے کایستھ (Kayastha)' کارکن اور پجاری کا کام انہی برہمنوں کے ہاتھ سونپا گیا۔

میرا خاندان

میرا اپنا خاندان وائیں کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔یہی لقب شادی بیاہ کے تمام کاغذات میں بھی پایا جاتا ہے۔شادی بیاہ کے ناتے سے پتہ چلتا ہے کہ وائیں خاندان کا تعلق صرف چند ایک محدود خاندانوں سے رہا جو پہلے برہمن تھے اور جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ وائیں شاید سنسکرت زبان کے وانی یا اس کی دھونی یعنی آواز سے نکلا ہو۔اسی لیے بہت سے لوگ اس کو وانی کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔سنسکرت میں وانی کا مطلب لفظ اور دھونی کے معنی آواز ہوتے ہیں اور خاص طور پر یہ وید کی آواز کو صحیح طور سے ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے چونکہ وید شروع میں نہیں لکھا گیا اور دراصل اس کا لکھنا عیب جانا جاتا رہا۔لفظوں کی ادائیگی اس کی اپنی آواز پر منحصر تھی۔یہ آواز الہامی خیال کی جاتی ہے اسی لیے وید بھی الہامی کتاب سمجھی جاتی ہے کیونکہ وید کو کسی ایک شخص نے نہیں لکھا۔اسے سنسکرت میں شرتی یعنی سنی ہوئی کتاب کہا جاتا ہے۔شاید وہ برہمن خاندان جس نے وید کی آواز کا صحیح تلفظ محفوظ کرنے میں مہارت حاصل کرلی۔اُسی خاندان کو وانی کے لفظ سے یاد کیا گیا لیکن چونکہ یہ لفظ کشمیر کے باہر نہیں ملتا اس لیے اس معنی پر بہت سے عالم شبہ کرتے ہیں۔اگر ہم اس بات کا خیال رکھیں کہ کشمیر میں برہمنوں نے مختلف پیشے اختیار کیے اور ہر پیشہ والوں نے اپنے پیشہ کے لحاظ سے اپنا لقب منظور

کروایا تو وائیں یا وانی کو اس لقب کو مقبول بنانے میں کیوں مشکل ہونا چاہیے۔ پھر بھی عام کشمیریوں کی رائے مختلف ہے اور اس رائے سے میرے دادا غلام رسول دانی کے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن دانی اتفاق کرتے ہیں۔ اس رائے کے مطابق وائیں یا وانی کا آبائی پیشہ تجارت تھا اس لیے اس لفظ کا تعلق سنسکرت کے لفظ ونک سے ہے۔ جس سے موجودہ ہندی زبان میں بنیا نکلا ہے۔ جیسے پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس کا کوئی تعلق ویشیر لفظ سے نہیں۔ گو کہ ویشیر ذات کا پیشہ بھی تجارت اور زراعت رہا ہے۔ سنسکرت ونک سے ہی شاید کشمیری وائیں بنا ہو لیکن کشمیر میں بہت کم برہمنوں نے اپنا آبائی پیشہ پر اکتفا نہیں کیا۔ بہت سے پنڈتوں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا جیسے آج بھی وہ کرتے ہیں۔ اسی طرح میرے خاندان کے لوگ بھی تجارت کے کام میں سرگرم ہو گئے۔ وہ زیادہ تر پشم اور اس سے بنا ہوا پشمینہ شال کی تجارت کرتے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قالین اور دوسری دستکاری کی اشیاء بھی فروخت کرتے تھے اس پشم کی تجارت نے انہیں لداخ، تبت، یارقند اور کاشغر پہنچایا اور دوسری طرف ثمرقند اور بخارا کی طرف روانہ کیا۔ یہ کب اور کیسے ہوا ایک لمبی داستان ہے۔

کشمیر کی تاریخ

وادیٔ کشمیر جس قدر پرفضا اور پرلطف خطہ ہے اس کی تاریخ اس کے بالکل برعکس اتنی ہی پیچیدہ رہی ہے۔ قدرت کی دین نے بہت سے حملہ آوروں کی آنکھوں کو اس طرف توجہ دلائی۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت سی قومیں یہاں وارد ہوتی گئیں اور پھر باہر جانے کا نام نہیں لیا۔ ان میں سے بہت ساری یہاں کے لوگوں میں گھل مل گئیں اور کچھ لوگوں نے اپنی خاندانی اور نسلی یک جہتی علیحدہ بنا رکھی لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ کشمیری قوم ہمیشہ محکوم اور مظلوم رہی۔ اگر ہم صرف تاریخی دور کو لیں تو ساتویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک جب مغلوں نے اس خطہ کو فتح کیا۔ کشمیر میں آزاد سلطنت قائم رہی۔ اس کے علاوہ عرب فتوحات کے زمانے میں کشمیری تسلط پنجاب پر بھی رہا اور کشمیری فوجوں نے بنگال تک اپنے ہاتھ دراز کیے۔ جب دہلی میں ترک مملوکوں (Mamluk) نے اپنی سلطنت قائم کی کشمیر ان کے قبضے سے باہر رہا۔ سلطان محمود غزنوی دو دفعہ

حملہ آور ہوا لیکن صرف پہاڑی علاقوں تک پہنچ کر واپس ہو گیا۔ اسی طرح جب امیر تیمور نے دہلی فتح کیا وہ بھی پہاڑی علاقوں سے گزر کر واپس چلا گیا۔

جن حملہ آوروں نے اپنا تسلط یہاں جمایا ان میں موریہ خاندان کی حکومت، بلخ کے علاقوں سے آنے والے یونانیوں کی حکومت، شک اور کوشان بادشاہوں کا تسلط اور آخر میں ہون راجاؤں کا غلبہ شامل ہے۔

ساتویں صدی کے آخر میں وادیٔ کشمیر میں کرکوٹ خاندان کے راجاؤں نے پھر سے آزادی کا پرچم لہرایا۔ اس وقت سے لے کر تیرہویں صدی کے آخر تک کئی ہندو خاندان بدلتے رہے لیکن کشمیر کی ثقافتی تاریخ میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ پہلے دور میں کشمیر میں بودھوں کا اثر بہت پھیلا۔ ہونوں کے زمانے میں تبدیلی آئی۔ لیکن قومی تشخص، ہندو مذاہب کا غلبہ، برہمنوں کا عروج اور علم و ہنر کی ترقی اور خاص کر سنسکرت زبان اور ادب کا فروغ ساتویں صدی کے بعد شروع ہوا۔ زیادہ تر کشمیر کی تاریخ جداگانہ رہی لیکن اگر ہم کلھن کی تاریخ اور اس کے بعد کے مؤرخ جونراج کو اچھی طرح پڑھیں تو ہمیں کشمیری راج کی اندرونی برائیوں کا اور وزیروں کا آپس میں سیاسی ٹکراؤ کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے۔ یہ ٹکراؤ ایسے تھے جو کبھی ختم ہونے والے نہیں تھے۔

ایسی حالت میں چودہویں صدی کے شروع میں منگولوں کے دو حملے ہوئے جن سے کشمیر اور کشمیری سماج ہل کر رہ گیا۔ اس کے نتیجہ میں وہاں دو اشخاص سامنے ابھرتے ہیں۔ ایک لداخی بودھ شہزادہ رنچن اور دوسرا ایرانی یا وسط ایشیائی شاہ میر۔ کشمیر کی ہندو مہارانی کوٹارانی سے دونوں یکے بعد دیگرے شادی کرتے ہیں۔ رنچن خود بلبل شاہ کے ہاتھوں اسلام سے فیض یاب ہوتا ہے اور اس طرح وہ اسلام کی پہلی مسجد ''خانقاہ'' کی بنیاد رکھنے کا شرف حاصل کرتا ہے۔ اس وقت سے لے کر ڈوگرہ راج کے وجود میں آنے تک (یعنی انیسویں صدی کے درمیان) اسلام کا پرچم کشمیر میں لہراتا رہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارے برہمن یہاں سے ختم ہو گئے۔ اس مسلم دور میں بھی بہت سے وزیر کشمیری برہمن تھے۔ ان میں سے کچھ نے اسلام قبول کیا اور کچھ نے نہیں۔ فارسی لفظ کارکن جو برہمنوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہے ظاہر کرتا ہے کہ حکمرانی کے کام میں ان کی شرکت کم نہیں تھی۔ اس کے باوجود اسلام کا دور دورہ اُسی طرح ہوا

جیسے پہلے بودھ مت سے بدل کر شو اور دوسرے ہندو مذاہب کا چرچا ہوا۔ یہ کیونکر ہوا اور کیسے ہوا ایک بڑی لمبی داستان ہے۔ اس انقلابی تبدیلی میں مسلم درویشوں کا ہاتھ بہت زیادہ ہے اور ان میں سیّد علی ہمدانی کے کارنامے کشمیر کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یادگار رہیں گے۔ ان کے شاگردوں کی بدولت اسلام یہاں مقبول عام ہوا گو کہ بعد میں شمس الدین عراقی کے خاندان نے بھی کافی کام کیا۔ بہر حال درویشوں اور شیخوں کا اثر یہاں بہت زیادہ رہا اور انہی کے ہاتھوں یہاں خاندان کے خاندان اسلام سے فیض یاب ہوتے رہے اور اسی وجہ سے یہ نو مسلم نیا خاندانی لقب اپنے ساتھ لائے اور ہمیشہ کے لیے اپنائے رکھے جس طرح کے میرے خاندان والے آج تک دائیں کہلاتے ہیں۔

اس تبدیلی میں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں۔ ایک کشمیری ہندو بھگتن للّہ شری یا للّہ یوگی شری جس نے پہلی دفعہ کشمیری زبان میں اپنے خیالات کو ظاہر کیا اور روایتی ہندو مذہب اور بت پرستی کے خلاف عوام کو بھڑکاتی رہی۔ اس کی نظم آج بھی کشمیریوں کو بڑی پیاری لگتی ہے۔ اس کی ملاقات سیّد علی ہمدانی سے بھی ہوئی اور وہ اس طرح آغازِ اسلام کا کشمیر کی تاریخ پیش خیمہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر رشی درویشوں پر بہت زیادہ پڑا۔ اسی چودھویں صدی میں کشمیر میں سلطان سکندر کی حکومت قائم ہوئی جسے بت شکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مؤرخ یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے بہت سے مندروں کو توڑا اور زبردستی اسلام پھیلایا گو کہ اس کے اپنے وزیر ہندو برہمن تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے۔ اُسی کے دور میں امیر تیمور کا حملہ ہوا جو پہاڑی علاقوں تک پہنچا لیکن کشمیر کے اندر نہیں آیا۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ سلطان سکندر نے اپنی بقاء کے لیے امیر تیمور کی (خبر دستی پر بہت سے سونے چاندی اُسے) دینے کی پیشکش کی لیکن تیمور نے اُسے معاف کیا اور صرف اس کی حاضری پر اکتفا کیا۔ یہ سونے چاندی کہاں سے آئے اور کہاں گئے۔ ظاہر ہے یہ ان مندروں سے لیے گئے جہاں یہ صدیوں سے جمع ہو رہے تھے اور جس کا علم سلطان سکندر کے وزیروں کو پوری طرح سے تھا۔ اسی مال کی لوٹ کھسوٹ سے جو مندروں کی توڑ پھوڑ سے ہوئی سلطان سکندر کو بت شکن کہا جاتا ہے۔ دراصل اسلام کی تبلیغ کی وجہ اور تھی جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد سلطان زین

العابدین کی لمبی حکومت قائم ہوتی ہے جس نے کشمیر کی ایک نئی شکل وصورت بنا کر رکھ دی۔ مسلم کشمیر کی اصل بنیاد اسی سلطان نے رکھی۔ اس نے برہمنوں کو اس طرح کی رعائتیں دیں جو اس نے مسلمانوں کو دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اور مسلم کشمیریوں میں کبھی جھگڑے نہیں ہوئے۔

کشمیر کی ثقافت

اس آزاد سلطنت میں کشمیری ثقافت اپنے ارتقاء کی انتہا تک پہنچی۔ کشمیری زبان کے علاوہ فارسی کا زور بھی بڑھتا گیا کیونکہ اس کا تعلق وسط ایشیاء سے بڑھتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چودھویں صدی میں یہ بودھ مت کا گہوارہ تھا۔ روایت کے مطابق چوتھا بودھوں کا بڑا جلسہ یہیں منعقد ہوا۔ جسے کشان شاہ کنشک نے بلوایا تھا۔ اس کے پیشتر ہی سے یہاں بہت سے ستوپے اور خانقاہیں موجود تھیں۔ یونانیوں نے اپنا فن کشمیر کو دیا اور اس کا اثر یہاں کے فنونِ لطیفہ اور تعمیرات پر پڑا۔ پتھر اور لکڑی پر نقش گری بہتر سے بہتر ہوتی گئی۔ پتھر کے خوبصورت بت تیار ہونے لگے۔ اس کے علاوہ تانبے اور کانسی کے خاص قسم کے مجسّمے کشمیری فن کے نمونے مظہر ثابت ہوئے۔ انہیں کشمیر میں وجہ قطعہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا اثر وسط ایشیا اور چین میں پھیلتا چلا گیا۔ گلگت اور چلاس کی چٹانوں پر کندہ فن پر اس کا بہت ہی زیادہ اثر ہوا۔ گلگت کے پٹول شاہی خاندان کا تعلق کشمیر کے راجاؤں سے مضبوط ہو گیا اور اسی طرح چین کے ٹانگ حکمرانوں کے ساتھ ان کے تعلق سے بڑا نزدیکی رشتہ قائم ہوا۔ اس کے نتیجہ میں چین سے بودھ سیاح یہاں متواتر آتے رہے اور کشمیر کے حالات بیان کرتے رہے۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں شنکرا چاریہ کے مبلغوں نے جب یہاں ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالی تو بودھ مت کی جگہ رشومت اور دوسرے ہندو دیوی اور دیوتاؤں کی پرستش شروع ہوگئی اور برہمنوں کا دوبارہ نئے سرے سے ابھرنا شروع ہوا اسی کے نتیجے میں سنسکرت زبانوں کو پھر سے فروغ حاصل ہوا۔ نیل مت پران اور مہاماتیہ کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ روایت کو ایک نئے ڈھنگ میں ڈالا گیا۔ نئے نئے تیرتھ مقام قائم ہوئے اور بہت سے مندر وجود میں آئے۔ بودھ ثقافت کی جگہ ہندو ثقافت نے لے لی۔

منگولوں کے حملے نے دوبارہ کشمیر کو جگا دیا اور جیسے پہلے کہا جا چکا ہے اسی کے نتیجہ میں یہاں مسلم حکومت قائم ہوئی۔ اب وسط ایشیاء کے ساتھ ایک نیا رشتہ قائم ہوا۔ وہاں سے بہت سے لوگ، شہزادے اور درویش ترکِ وطن کر کے یہاں پناہ لی۔ کشمیر کے ہونے والے سلطان شاہ میر کا یہاں آنا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہیں سے اسلام براہِ بدخشاں اور سوات اس خطہ میں پہنچا۔ اس پر سب سے گہری چھاپ سیّد علی ہمدانی اور ان کے شاگردوں کی ہوئی جو ختلان (موجودہ کلابہ) سے یہاں تشریف لائے۔ انہیں کی وجہ سے یہاں اسلام کو تقویت حاصل ہوئی اور شرینگر میں ان کی خانقاہِ مُعلّیٰ اسلام کا مرکز بن گیا۔ اُدھر شہر ختلان بھی کشمیریوں کی زیارت گاہ بن گیا۔ وہاں سیّد علی ہمدانی کے مزار کے اردگرد سینکڑوں کشمیری مدفون ہوئے۔ آج صرف وہاں ایک ہی کشمیری کی قبر باقی ہے۔ دوسری قبریں مسمار کر دی گئی ہیں اور ان کی جگہ وہاں اب وسیع سیر گاہ بنا دی گئی ہے۔

سیّد علی ہمدانی نے نہ صرف یہاں اسلام پھیلایا بلکہ کشمیر کا تعلق نئے سرے سے وسط ایشیاء کے اس خطہ سے قائم کیا جسے آج ہم تاجکستان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر کا رشتہ کرغزستان کی طرف ہو چلا جس کا جنوبی حصہ پامیر اور ٹین شان کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان سارے خطوں میں موجود اور کشمیر کے قدرتی مناظر میں یگانگت پائی جاتی ہے جیسے قدیم زمانے میں ثمر قند (سمر قند) اور بخارا کی تہذیب کے ساتھ کشمیر کا تعلق تھا اور کشمیر سے بودھ مت اور اس کا فنونِ لطیفہ وہاں منتقل ہوتا رہا۔ اب سلسلہ اُلٹ گیا۔ ختلان، سمرقند اور بخارا کی نئی سلطنت کی اسلامی تہذیب نے کشمیر پر اثر انداز ہونا شروع کیا۔ بہت سے سادات، درویش، بخاری، قریشی، میر اور مرزا سمرقند، بخارا اور ختلان سے یہاں آ کر رہنے لگے۔ فارسی زبان بھی اسی راستہ کشمیر پہنچی اور بہت ساری دستکاری کے ہنر اور فن تاجکستان سے کشمیر پہنچے۔ شاید اسی زمانے میں قالین بافی اور نمدہ بنانے کی ترکیب یہاں آئی۔ اس سے پیشتر مسلمانوں سے قبل ان کا کوئی نمونہ ابھی تک کشمیر میں دریافت نہیں ہوا ہے۔ لکڑی کے کام میں خوبصورتی اور نقش گری پر جمال آ گیا۔ زردوزی کا کام شروع ہوا۔ ریشمی کپڑے بننے لگے۔ پشم کی درآمد بڑھ گئی تو پشمینہ کا کام عروج پر پہنچ گیا اور ان سب کی تجارت نے وسط ایشیاء کو کشمیر کے قریب تر کر دیا۔

کشمیر کی معاشی حالت پر ان سب کا زبردست اثر ہوا۔ حکمران طبقہ باہر سے آ کر یہاں

برسرِ اقتدار آیا۔ ان کے ساتھ ان کے مددگار اور سپاہ بھی آ پہنچے۔ عام لوگوں کی اقتصادی حالت قدرے بہتر ضرور ہوئی لیکن خاندان کے خاندان ہنرمندی کی غلامانہ زنجیروں میں جکڑے رہے۔ ایک طرف حاکم خون چوستے رہے اور دوسری طرف تجارتی کھچاؤ (Exploitation) کا ایک نیا جال بچھ گیا چونکہ برہمنوں کو اقتدار میں حصہ کم دستیاب ہوا۔ ان کی توجہ تجارت کی طرف بڑھتی گئی۔ ان میں وہ برہمن خاندان کے لوگ بھی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان نومسلم برہمن خاندانوں نے تجارت کو پھیلانے میں بہت کام کیا اور انہیں کی بدولت یارقند، کاشغر، سمرقند اور بخارا کے ساتھ تجارت کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ میرے خاندان کا تعلق بھی انہی تاجروں سے تھا جو وائیں کے نام سے مشہور ہوا۔

ہنرمندوں کے پاس معاش کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ وہ اپنی دستکاری کا سامان برہمن تاجروں کے ہاتھ بیچتے۔ یا بیگار میں حکمران آفسروں کا کام کرتے اور کسی طرح اپنی گزراوقات کرتے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے باہر جانا شروع کیا۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ سنہار اور زرگر یارقند اور سمرقند پہنچ گئے ہوں، جہاں آج بھی ان کے خاندان کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

کلابہ اور تاجکستان کے دیگر قصبہ جات میں ان کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ بخارا تک یہ پہنچ جاتے تھے۔ بلتستان کی روایت کے مطابق یہاں کے مقبوں بادشاہوں کی بنیاد کشمیر سے ہی نکل کر ایک نوجوان شخص نے ڈالی جس کا نام ابراہیم بتایا جاتا ہے۔ پھر ان کے بعد ہنرمند کاریگروں کا ریوڑ یہاں آتا گیا جس کے اثرات بلتستان کے فنِ تعمیر پر صاف نظر آتے ہیں۔ ہنزہ کے پرانے قلعہ التت اور بلتت میں کشمیری کاریگری کا نمایاں طور پر کافی ذکر آتا ہے۔ انہوں نے ہی گلگت کے پرانے شاہی قلعہ کی تعمیر کی تھی۔ اسی طرح کوہستان، سوات اور دیر میں ان کاریگروں کا اثر ورسوخ کافی ملتا ہے۔

کشمیریوں کی ہنرمندی اور یہاں کی خوبصورتی اور زرخیزی نے امیر تیمور کی توجہ بھی اس طرف دلائی لیکن پہلے جیسے بتایا جاچکا ہے وہ خود کشمیر کے اندر داخل نہیں ہوا۔ اگر ہم مورخوں کی باتوں پر یقین کریں تو وہ صرف یہاں سے دولت حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس سے بھی زیادہ یہاں کے سلطان کی پیروی۔ کہاں تک وہ اس کام میں کامیاب ہوا یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال اُسی

کے زمانے میں یہاں سیّد علی ہمدانی تشریف لائے ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ امیر تیمور کی وفات کے بعد چغتائی خاندان کے شاہوں کی آنکھ اس طرف لگی رہی جو اس وقت کاشغر پر قابض تھے۔ آخر کار سولہویں صدی کے شروع میں سلطان ابو سعید نے لداخ اور بلتستان فتح کرنے کے بعد کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اس کے کمانڈر مرزا حیدر تغلق نے اس پر قبضہ کر لیا۔ گو کہ یہ قبضہ مستقل نہ رہا لیکن کشمیر کا سیاہی دروازہ شمال کی طرف کھل گیا۔ اس کا سب سے زیادہ فائدہ مغل بادشاہ ہمایوں کے بھائی کامران نے اٹھایا اور اس نے اپنا لشکر کشمیر کی طرف روانہ کیا۔ اس مغل دخل اندازی میں بھی ہاتھ مرزا تغلق کا تھا۔ جس نے اپنی خدمات مغلوں کے ہاتھوں بیچ دی تھیں۔ مرزا حیدر تغلق کی گورنری کشمیر کے لیے کیا ثابت ہوئی کہنا بہت مشکل ہے لیکن ایک ضروری بات سامنے آئی ہے۔ مرزا نے اب کشمیر کا رُخ ہندوستان کی طرف کر دیا۔ اُسی نے مغلوں کو راہ دکھائی اور اکبر بادشاہ نے کشمیر کو ہندوستان میں ضم کر لیا۔ پہلی دفعہ کشمیر بھی مغل سرکار کے ماتحت آیا۔ کشمیر کی آزادی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ مغلوں کے بعد افغانوں کا تسلط ہوا۔ پھر سکھوں کا اور اس کے بعد انگریزوں کا۔ انہوں نے اس کو ڈوگرا گلاب سنگھ کے ہاتھوں ایسا فروخت کیا جیسے غلاموں کو فروخت کیا جاتا ہے۔

مغلیہ سلطنت بظاہر ترقی کا دور مانا جاتا ہے لیکن اس میں کشمیری عوام اور خواص کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ کشمیریوں کی نظر میں یہ ان کی آزادی کو پہلی اور آخری ضرب لگی اور وہ کشمیری قوم جس نے سینکڑوں برس حکمرانی کی تھی اور اپنی فوجی طاقت بڑھائی تھی دھیرے دھیرے دبتی اور پستی گئی۔ یہاں تک مشہور ہو گیا کہ کشمیری آرام طلب اور کمزور قوم ہے۔ صرف پر لطف فضا میں نمکین چائے پینا جانتی ہے۔ فوج کشی اس کی فطرت سے باہر ہے۔ لڑائی کرنا اس کا شیوہ نہیں۔ کوئی بھی باہر کی طاقت اس کو دبا کر محکوم بنا سکتی ہے۔ شاید اس خیال نے برصغیر کی آزادی کے بعد بھارتی فوجی قوت کو اپنے شکنجے میں دبائے رکھنے کے لیے اکسایا۔ شاید اس وقت کی سیاست نے بھارت کو یہ موقع فراہم کیا ہو لیکن یہ سمجھنا کہ کشمیری کبھی نہیں جاگ سکتے اور کبھی لڑنے کے قابل نہیں ہو سکتے سراسر غلط ہے۔ میں اپنے بھارتی دوستوں سے ہمیشہ کہتا رہتا ہوں کہ بھارت جو اتنی رقم وہاں خرچ کر رہا ہے اور اتنی فوج وہاں رکھی ہے یہ بالکل بے معنی ہے۔ کشمیری خود دار قوم ہے اور وہ کبھی بھارت کے طرفدار نہیں ہو سکتے۔ انہیں آپ ان کی قسمت پر چھوڑ دیں اور آزادی کی سانس لینے دیں۔

مجھے خوشی ہے کہ میرے بہت سارے پڑھے لکھے اور بھارتی دوست میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں لیکن وہ اپنے ملک کی سیاست سے لاچار ہیں۔

مغلیہ زمانے سے ہی کشمیریوں کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وسط ایشیاء سے کشمیریوں کا گہرا تعلق کم ہوجاتا ہے اور ان کی نظر اب ہندوستان کی طرف مبذول ہونے لگتی ہے۔ کشمیری پڑھا لکھا طبقہ مغل راج کے شہروں میں آنا شروع کرتا ہے اور اپنی کاریگری سے اس وقت کی صنعت میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ ان کے ملک کے دلکش منظر مغل بادشاہوں اور ان کی بیگمات کو وہاں کھینچ لاتے ہیں۔ کشمیر کو فردوس کا مقام دیا جاتا ہے لیکن کشمیری عوام پستے چلے جاتے رہے۔ اس کے باوجود کشمیری تاجروں نے مغل راج کے شہروں میں کشمیری تجارتی مقام اور کشمیری محلے بنانا شروع کیے۔ یہ سلسلہ افغان دور میں بھی چلتا رہا اور کشمیریوں نے پشاور اور کابل میں بھی اپنا ٹھکانا بنالیا۔ خاص طور پر ان کا پشمینہ کا کام اتنا مشہور اور سودمند ہوگیا کہ انیسویں صدی کے شروع میں سکھوں اور ڈوگروں کے درمیان یہ کشمکش چل پڑی کہ اس تجارت پر کس طرح قابو کیا جائے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ اصل پشم لداخ اور تبت سے آتا ہے انگریزوں کو بھی اس کا علم ہوگیا تھا جس کا ذکر مورکرافٹ کی کتابوں میں آتا ہے۔ لیکن اُن کی سیاست کا دائرہ ابھی ان شمالی علاقوں سے بہت دور تھا اور چونکہ ان کی دشمنی سکھوں سے تھی۔ انہوں نے ڈوگروں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی، یہی وجہ ہے کہ وادیٔ کشمیر کو جو اس وقت سکھوں کے قبضے میں تھا کنارہ کشی کر کے ڈوگروں کا کمانڈر زور آور سنگھ سیدھا لداخ پہنچا تاکہ اس تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے اور کشمیر کی اقتصادیات کو زک پہنچائے۔ مغلوں نے لداخ پر قبضہ کشمیر سے چل کر اسکردو کے راستے کیا۔ ان کا مقصد سیاسی تھا تاکہ کاشغر سے آنے والے حملہ آواروں کو ہمیشہ کے لیے روک سکیں۔ ڈوگروں کا مقصد اقتصادی تھا۔ وہ پشم کی تجارت کو اپنے قابو میں کرنا چاہتے تھے اس لیے پہلے لداخ پر قابض ہوئے۔ وہاں سے سکردو آئے تاکہ اُدھر کا راستہ بالکل بند کردیا جائے۔ جب انگریزوں نے انہیں موقع دیا تو پورے کشمیر کو کوڑیوں کے دام خرید کر نہ صرف وہاں کی تجارت اور صنعت پر قابض ہوئے بلکہ پورے ملک کے دعویدار بن گئے۔ کشمیری خود بے بس تھے۔ وہ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ہر اس طاقت کا ساتھ دیتے رہے جس کا سورج چمکتا رہا، اس میں ہندو پنڈت اور مسلمان

سوداگر دونوں ایک ساتھ پیسے جانے لگے۔ جب ظلم بڑھتا گیا تو کشمیریوں نے مجبور ہو کر اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر ڈوگروں کے دور میں ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جانا شروع کیا۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے سکونت اختیار کی اپنا کشمیری پن نہیں چھوڑا۔ ان کا پہناوا ان کی خوراک' ان کے آداب' ان کے دستر خوان اور ان کی رشتہ داری ہمیشہ کشمیریوں کو الگ کرتی رہیں اور یہ ان کی شناخت بن گئی۔ وہ اپنی دستکاری اور ہنرمندی ساتھ لیتے جاتے اور اپنا خاندانی پیشہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے بڑے شہروں میں مثلاً سیالکوٹ' وزیر آباد' گوجرانوالہ' لاہور اور خاص طور پر امرتسر میں اپنا ٹھکانہ مضبوط بنا لیا اور چونکہ یہ حاکم نہیں تھے ان کا مشغلہ کاریگری' تجارت اور تعلیم کی طرف لگا رہا۔ انگریزوں کے زمانے میں جب کلکتہ تجارت کا مرکز بنا تو کشمیریوں نے وہاں بھی اور ڈھاکہ میں بھی کشمیری محلہ اور تاجروں کی کوٹھیاں قائم کیں۔

کشمیر سے خروج

میرے خاندان کے لوگ کشمیر میں شرینگر سے قریب پندرہ میل دور اننت ناگ (اسلام آباد) کے راستے میں اشنول دیہات میں رہائش پذیر تھے اور خاندانی پیشہ پشمینہ کی تجارت' قالین بافی اور دست کاری تھا۔ سنہ عیسوی 1851ء کے قریب جب ڈوگروں کا راج وہاں ستم ڈھا رہا تھا میرے جد امجد نے سیالکوٹ میں آ کر تجارت شروع کی۔ اب ان کا رُخ جو یارقند' کاشغر' سمرقند اور بخارا کی طرف تھا کم ہوتا گیا۔ انگریزوں کے علاقے میں داخل ہونے کی ان میں ہمت آ گئی۔ کشمیر میں قالین بافی اور دستکاری کا کام خاندانی ہوتا ہے۔ یہ ایک آدمی تک محدود نہیں ہوتا۔ پورے خاندان کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر صبح سے شام تک ایک گول دائرہ بنا کر کام کرتے ہیں۔ چائے سماوار میں پکتے پکتے سبز چائے کا رنگ گلابی سا ہو جاتا ہے۔ چائے کا دور چائے کے ڈولوں (پیالی) میں باری باری چلتا رہتا ہے اور چونکہ یہاں سردی زیادہ ہوتی ہے گرم گرم چائے نمک کے ساتھ گرمی پیدا کرتی ہے اور ساتھ ہی خوراک کے بھی کام آتی ہے۔ عورتیں جو کام میں ہاتھ بٹاتی ہیں اپنے لمبے لمبے آستین جو ہاتھ سے باہر نکلا ہوتا ہے گرم گرم پیالیوں کو اُٹھا کر ایک دوسرے کو دیتی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ عورتیں جو لمبی قمیض پہنے ہوتی ہیں لکڑی کی اوکھلی میں اناج کوٹتی ہیں۔

کشمیر میں چونکہ سردی بہت زیادہ ہوتی ہے میں نے اپنی والدہ کو پیٹ پر کانگڑی باندھتے دیکھا ہے وہ کانگڑی کو لے کر سو بھی جاتی تھیں یہ جلتی ہوئی پٹارے نما آگ کا چلتا پھرتا ہیٹر کشمیر کی خاص چیز ہے۔ایک دوسرا طبقہ غریب کشمیریوں کا وہ تھا جو سردیوں میں وادیٔ کشمیر کو چھوڑ کر پنجاب کے شہروں میں آ جاتے تھے اور یہاں لکڑہارے یا بھشتی کا کام کرتے تھے۔ پنجاب میں انہیں ہاتو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بچپن میں ان ہاتو مزدوروں کو امرتسر میں بہت دیکھا ہے۔ یہ مزدور روپیہ کما کر گرمیوں میں واپس کشمیر چلے جاتے تھے۔

میرے دادا کے دادا دو بھائی تھے۔ جن کا نام خضر رجو اور محمد رجو تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے سیالکوٹ میں اپنی تجارت شروع کی۔ خضر جو کشمیر سے مال لاتے اور محمد جو اسے بیچنے کے لیے کلکتہ تک سفر کرتے۔ وہاں کشمیریوں کی زندگی بھی عجیب سی تھی۔ ان کی مشابہت اُن کشمیریوں سے کی جا سکتی ہے جو شروع شروع میں انگلینڈ جا کر اپنی محنت سے روزی کماتے اور رقم جمع کر کے اپنے خاندان والوں کو اپنے ملک بھیج دیتے تھے۔ چونکہ یہ کشمیری اپنی بیویاں لے کر کلکتہ نہیں جاتے تھے وہ سب ایک بڑی حویلی میں قیام کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک قسم کا کارواں سرائے ہوتا جہاں کوئی بھی کشمیری تاجر اپنے مال واسباب کے ساتھ ٹھہر سکتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ کلکتہ جانے کا موقع ملا اور ویسی ہی ایک سرائے میں ٹھہرنا پڑا۔ یہاں مکمل طور سے کھانا نہیں پکتا تھا۔ قریب قریب سب تاجر اپنا کھانا باہر کھاتے۔ جہاں وہ سوداگری کرتے تھے صرف رات کے وقت اکٹھے ہوتے اور اپنی تجارت کے متعلق گفتگو کرتے اور ایک دوسرے سے مدد چاہتے۔ اسی جگہ شادی بیاہ کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ اس رشتہ داری میں کشمیر سے تعلق ضرور رکھا جاتا تھا۔ یہ اس لیے کہ کشمیری عام طور سے کشمیریوں میں ہی شادی کرنا پسند کرتا ہے۔ بہت مجبور ہو کر وہ اپنے کنبے سے باہر جا کر شادی کرتا ہے۔ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے خاندان والے اپنے کشمیری رسم ورواج کو برقرار رکھیں۔ باہر جا کر وہ مقامی زبان اختیار کر لیتا ہے اور اگر دو یا تین نسل وہاں گزر جائے تو اپنی زبان بھی بھول جاتا ہے لیکن اپنے رسم ورواج اور شکل وصورت سے کشمیری پہچانا جاتا ہے۔ وہ نہ کشمیری چائے چھوڑتا ہے اور نہ پالک کے ساتھ چاول کھانا۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں وہ ہزاروں میل

سفر کر کے کشمیری خاندان کے پاس آتا ہے اور وہاں شادی رچاتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر اس کا خاندان پرانے برہمن مسلمانوں سے ہو تو اُنہیں خاندانوں میں شادی کرنا پسند کرتا ہے۔ میرا اپنا وائیں خاندان اسی قسم کے دقیانوسی خیالات میں مبتلا رہا ہے۔ میرے اپنے زمانے تک ہم لوگوں نے برہمن مسلم کشمیری خاندانوں میں شادی کی۔ جن میں وائیں، بٹ، دار، بانڈے، پنڈت کول اور کچلو شامل ہیں۔ میری اپنی والدہ شریف بیگم دار خاندان اور دادی فاطمہ بیگم بٹ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ میرے خاندان والوں نے میرے اپنے زمانے تک برہمن مسلم خونی رشتوں کو قائم رکھنے میں فخر محسوس کرتے رہے ہیں۔

خضر جو کے تین لڑکے تھے، احد جو، عفی جو اور غفار جو۔ جب ان کے پاس کچھ رقم جمع ہوگئی تو یہ امرتسر منتقل ہو گئے اور اپنی حویلی اس جگہ بنائی جو نمک منڈی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بہت بڑی حویلی تھی۔ اس کے اردگرد سارے کشمیری کاریگر رہائش پذیر تھے۔ یہ ان کی ایک قسم کی ایک فیکٹری تھی جہاں مال تیار کیا جاتا اور یہاں تجارت بھی کی جاتی تھی اور چونکہ اس کے سربراہ میرے اپنے پردادا تھے انہیں کے نام سے یہ گلی چودھری غفار وائیں کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نام 1947ء تک قائم رہا۔ گو بعد میں حویلی دوسری عالمگیر جنگ کے دوران فروخت ہو چکی تھی اور میرے سارے رشتہ دار یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے تھے۔

دوسرے بھائی محمد جو کلکتہ میں زیادہ تر رہتے اور وہیں تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ان کا ایک ملازم ساری رقم لے کر بھاگ گیا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ محمد جو کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اس کی تلاش میں وہ نکلے۔ اس زمانے میں (قریب 1860-1865 کے درمیان) انگریزوں نے ایک لمبی سڑک کلکتہ سے بمبئی تک آمدورفت کے لیے بنائی تھی۔ اسی وجہ سے اڑیسہ کے شہر سمبلپور سے گزر کر مدھیہ پردیش کے چھتیس گڑھ کے جنگلوں کو پار کرتی تھی اور رائے پور اور ناگپور سے گزر کر بمبئی کو جاتی تھی۔ اس کے لیے انگریزوں نے رائے پور میں اور ناگپور کے قریب کامٹی میں فوجی چھاؤنی بھی بنائی۔ رائے پور میں مدراس کی ایک مسلمان کمپنی تعینات تھی۔ جب یہ فوجی اپنی ملازمت کی مدت پوری کر چکے تو وہ یہیں آباد ہو گئے اور انہیں کے نام سے یہ علاقہ بیرنگ بازار کہلانے لگا۔ بیرنگ معنی باہر سے آنے والے لوگ۔

محمد جو کو اطلاع ملی کہ اس کا ملازم اسی فوجی سڑک سے بھاگ کر سمبلپور کی طرف گیا ہے۔ وہ اُسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ جب وہ اس شہر میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ جنگل کی طرف بھاگ گیا ہے۔ محمد جو عبداللہ کو چھتیس گڑھ کے جنگلوں میں تلاش کرتے رہے اور آخر کار ایسے جنگلی علاقے میں پہنچے جو وہاں کے ایک قلعہ (یعنی گڑھ) کے نام پھولجھر گڑھ کہلاتا تھا۔ جو ایک گونڈ رانی کے قبضہ میں تھا۔ اس کا کوئی لڑکا نہیں تھا وہ بہت غمگین رہتی تھی کیونکہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔

ہندوستان میں آباد

چھتیس گڑھ کا نام پچھلی صدی میں انگریزوں نے دیا کیونکہ یہاں چھوٹے بڑے چھتیس گڑھ (قلعے) تھے جن پر چھوٹے چھوٹے گونڈ نسل کے راجاؤں کا قبضہ تھا۔ قدیم زمانے میں یہ علاقہ دکھن کوشل میں شامل تھا۔ گپتا زمانے کا ایک بہت بڑا مندر رائے پور سے پچپن میل کے فاصلہ پر شری پور میں اب بھی موجود ہے۔ ان سب گونڈ راجاؤں کو انگریزوں نے اپنے قابو میں کیا اور ان کے بچوں کی تربیت کے لیے رائے پور شہر میں راج کمار کالج کے نام سے ایک درسگاہ کھول دی جو اس نام سے 1947ء تک اسی مقصد کے لیے قائم رہی۔ یہاں خاص طور پر گونڈ راجاؤں کے بچے ہی داخل ہوتے تھے اور ان کی تعلیم میں اپنے راجواڑے کی حکومت کرنا اور انگریزوں کی اطاعت شامل تھی۔

پھولجھر کی رانی نے جب ایک خوبصورت کشمیری نوجوان کو اس کے اپنے ملبوسات میں دیکھا تو اس پر محو ہو گئی۔ محمد جو نے اس رانی کو کچھ نادر کپڑے بطور تحفہ دیئے۔ ایسے کپڑے اُس جنگل میں کبھی دیکھے نہیں گئے تھے۔ رانی بوڑھی تھی اُس نے محمد جو کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ محمد جو نے عبداللہ کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ وہ کئی برس تک وہیں رہے اور اپنے بھائی کو قریب قریب بھول گئے۔ اس کا بڑا بھائی خضر جو یہی سمجھتا رہا کہ محمد جو کہیں جنگل میں مارا گیا ہو۔ اتنے برسوں کے بعد بھی محمد جو گونڈی رسم و رواج کے مطابق پھولجھر رانی کا وارث نہ بن سکا اس لیے رانی نے اسے تقریباً چار سو گاؤں بطور انعام دے دیئے اور ایک دوسرے گونڈ

لڑکے کو گود لے کر وارث بنایا۔ اب اس پھولجھر گڑھ کی مرکزی جگہ کو بدل کر فوجی سڑک کے کنارے ایک نیا محل تعمیر کیا گیا۔ اس جگہ پہلے ایک سرائے ہوا کرتی تھی اس لیے اس جگہ کا نام بھی سرائے پالی پڑا۔

محمد جو نے اپنے لیے ایک نیا گاؤں بنایا جہاں سب باہر کے لوگ آ کر آباد ہوئے۔ یہ بھی فوجی سڑک کے کنارے سرائے پالی سے بارہ میل دور واقع ہے۔ چونکہ یہاں لوگ باہر سے آ کر بسنے لگے۔ اس گاؤں کا نام بسنہ ہوا۔ 1875ء کے قریب محمد جو نے یہاں پہلی جامع مسجد بنوائی۔ چونکہ بسنہ میں چاروں طرف سے سڑک آتی تھی۔ یہ تجارت کا ایک مرکز بن گیا۔ ہر ہفتہ یہاں بازار لگنے لگا۔ بہت سے بیوپاری یہاں آ کر بس گئے۔ ان میں گجرات سے کچھ مسلم میمن خاندان کے لوگ بھی تھے جنہیں یہاں کچھ کہا جاتا تھا۔ کچھ آس پاس کے برہمن، تیلی، حلوائی، کلار، دھوبی، لوہار وغیرہ قومیں بھی یہاں آباد ہوگئیں۔ دوسری طرف چمار (یعنی چرم کار) اور گھسئے (یعنی مہتر) آ کر رہنے لگے۔ اس سے زیادہ تعداد میں کچھ مقامی مسلم باشندے جمع ہو گئے۔ انہیں ترکاری اور پٹھان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ پٹھان دراصل وہ افغان لوگ تھے جنہیں مغلوں نے ہرایا تھا اور جنہوں نے یہاں جنگلوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ اسی طرح ترکاری دراصل ترک نسل کے لوگ تھے۔ جو ان سے بھی پہلے یہاں آ کر پناہ لے چکے تھے اسی لیے وہ مسلمانوں میں سب سے نیچی ذات سمجھی جاتی تھی۔ سینکڑوں برسوں بعد وہ اپنی تاریخ بھول بیٹھے تھے اور اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگے تھے۔ نہ ان کے پاس زمینیں تھیں نہ کوئی روزگار۔ محنت مشقت کر کے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ بسنہ آ کر قدرے ان کی زندگی بہتر ہوئی اور وہ سب مسلم قوم میں شریک ہوئے۔ دور افتادہ جگہوں میں خاص طور پر اڑیسہ میں ان میں سے کچھ لوگوں کی حالت بہتر تھی۔ وہ تجارت بھی کرتے تھے اور زمینوں کے مالک بھی تھے۔ جب محمد جو نے اپنا گاؤں بسنہ آباد کیا تو ان کے گرد سارے مسلمان جمع ہو گئے اور پھر انہیں کے لیے مسجد بنوائی گئی۔ اس مسلم آبادی نے نئے سرے سے مسلم تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ یہ مسلمان دانی گھر میں کام بھی کرتے تھے۔ ان کے ملازم بھی ہو جاتے تھے۔ انہیں کچھ زمینیں مل گئیں۔ ان کا محلہ ہندوؤں سے علیحدہ قائم ہو گیا۔

دانی کا خطاب

احد جو اپنی بیوی وہاں لے کر نہیں گئے تھے اور وہاں بھی انہوں نے شادی نہیں کی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے اپنی ساری کمائی لوگوں میں بانٹ دیتے تھے۔ جب کبھی انگریزوں کے فوجی دستے اس راہ سے پیدل گزرتے تو وہ انہیں مفت کھانا کھلاتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ اپنے اس کھلے ہاتھ کی وجہ سے اور خاص طور پر غریبوں میں دان و مال تقسیم کرتے کرتے وہ اس علاقے میں بہت مشہور ہو گئے۔ آخر کار انگریز سرکار نے انہیں دانی کے خطاب سے نوازا۔ یہ قریب 1880ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد وہ احد جو دانی کہلانے لگے اور یہ خطاب میرے خاندان میں ایسا جڑ گیا کہ آج بھی میں اپنے نام کے ساتھ دانی لکھتا ہوں۔ یہ سنسکرت زبان کا لفظ دان سے نکلا ہے جس کا مطلب دینے کا ہوتا ہے۔ اسی لفظ کے دان (معنی بھیک میں دی ہوئی چیز) بنا ہوا ہے۔

احد جو کے وارث

بہت سال گزر گئے اب احد جو کو اپنے بھائی اور بھتیجوں کا خیال آیا۔ آخر کار چار سو گاؤں کے وہ مالک تھے۔ ان کا کوئی وارث ہو گا۔ وہاں کی گونڈ رانی سے اجازت لے کر کلکتہ کے راستے اپنے بڑے بھائی سے ملنے سیالکوٹ آئے۔ انہیں دیکھ کر بڑا بھائی بہت خوش ہوا اور پھر اُسے بتایا کہ اس کے لڑکوں نے امرتسر میں کس طرح کاروبار شروع کیا۔ وہ امرتسر آئے وہاں بڑی خوشیاں منائی گئیں انہوں نے بھی اپنا قصہ سنایا۔ وہاں کی گونڈ رانی کا حال بتایا اور اپنے گاڑوں کے متعلق ذکر کیا۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ ان کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ وہ رو پڑے اور اپنے بڑے بھائی سے ایک بچہ کی بھیک مانگی۔ بھائی نے اپنے بڑے لڑکے غلام رسول دانی کو انہیں دینے کا وعدہ کیا لیکن چونکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی احد جو کو بہت پیار کرتے تھے اس لیے وہ دونوں احد جو کے ساتھ بسنہ چلے گئے۔ قریب دو تین سال گزر گئے اور 1884ء میں احد جو دانی انتقال کر گئے۔ ان کو بسنہ میں ہی مسجد کے نزدیک جو کہ پہلے دانی تھے ایک احاطے میں دفن کیا گیا جہاں آج بھی وہ اس قبر میں دفن ہیں۔

ان کی جائیداد کے وارث غلام رسول دانی ہوئے۔ اس وقت گونڈ رانی بھی مر چکی تھی۔ بعد میں 1905ء میں جب بنگال کی تقسیم ہوئی تو اس پھولجھر علاقہ کو اُڑیسہ سے نکال کر مدھیہ پردیش کے رائے پور ضلع میں ڈال دیا گیا۔ ہمارا گاؤں بسنہ بھی اس نئے ضلع میں شامل ہو گیا اور چھتیس گڑھ نئی کمشنری بن گئی۔ اُڑیا زبان کی جگہ چھتیس گڑھی کا رواج بڑھنے لگا۔ زمینداری کا نیا بندوبست شروع ہوا۔ اس معاملے میں غلام رسول دانی بالکل کورے تھے اُن کے پاس کوئی کاغذ نہیں تھا۔ نئے گونڈ راجہ نے اُن کے بہت سارے گاؤں چھین لیے اور انہیں صرف چالیس گاؤں دیئے گئے۔ غلام رسول دانی نے کوئی فکر نہ کی۔

اسی دوران جب رائے پور سے آنا جانا شروع ہوا تو وہاں کے مسلمانوں سے میل ملاقات بڑھی۔ ان میں ایک جانا پہچانا خاندان بیرنگ بازار میں رہتا تھا۔ جو نواب کے نام سے مشہور تھا۔ انہی کی ایک لڑکی سے احد جو نے شادی کر لی جن کو میں بھی بچپن میں بوڑھی دادای پکارتا تھا۔ اس بوڑھی خاتون نے ہمارے گھر بہت سارے مدراسی کھانے شروع کروائے۔ ان سے بھی کوئی اولاد احمد جو دانی کو نہیں ہوئی۔ اب رائے پور سے ریل گاڑی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہاں سے امرتسر جانا آسان ہو گیا تھا۔ احد جو اکثر امرتسر جاتے اور اپنے بھائی غفار جو کے پاس ٹھہرا کرتے تھے۔ اسی ایک سفر میں انہوں نے اپنے بھائی سے ایک لڑکا مانگا۔ غفار جو نے اپنی پہلی بیوی سے جو سب سے بڑا لڑکا تھا' انہیں دے دیا۔

غفار جو وائیں کی یکے بعد دیگرے چار بیویاں تھیں۔ اُن کی نیلی آنکھ کی وجہ سے انہیں غفار جو بلّہ بھی کہتے تھے۔ سب سے پہلی بیوی بٹ خاندانی سے تھی۔ اُس سے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکے غلام رسول اور عبدالرحمٰن اور ایک لڑکی خدیجہ بیگم جنہیں ہم پنجابی میں خجو کہتے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد دوسری بیوی سے تین لڑکیاں ہوئیں۔ غفار جو کی ایک لڑکی شاہ بیگم اور ایک لڑکا غلام قادر پیدا ہوئے۔ تیسری بیوی سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ صفورہ اور صوبیہ نام تھا۔ غفار جو کی چوتھی بیوی کو ہم سب سید و دادی کہتے تھے گو کہ وہ میری پردادی تھیں اور ان کا اصلی نام سعیدہ بیگم تھا۔ ان سے ایک لڑکا عباداللہ اور ایک لڑکی حنیفہ بیگم ہوئے۔ سب سے بڑے لڑکے غلام رسول کا قد چھ فٹ سے بھی اونچا تھا۔ آنکھیں نیلی اور چہرہ بھرا بھرا گول مٹول سا۔ رنگ بالکل صاف سفید تھا جس میں

لالی چھائی ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی صحت بنانے کا خیال رکھتے تھے اور حسب معمول اکھاڑے میں جا کر ورزش کرنا اور کشتی لڑنا ان کی عادت بن گئی تھی۔ اس وقت امرتسر میں کشمیری جوانوں کا یہ عام مشغلہ تھا۔ انہیں پڑھنے لکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ گھوڑے کی سواری کرنا اور خوبصورت تانگے رکھنا ان کا بڑا شوق تھا۔ اُنہی عادتوں کے ساتھ وہ اپنے تایا جی کے ہمراہ بسنہ پہنچے۔ وہاں جانے سے پہلے ان کی شادی فاطمہ بیگم سے ہو چکی تھی جو بٹ خاندان کی تھیں۔ امرتسر میں ان کے دو لڑکے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ ان میں سے سب سے بڑے میرے والد غلام نبی تھے جو 1885ء میں پیدا ہوئے۔ ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو بعد میں وفات پا گئی۔

میرے دادا غلام رسول دانی جس قدر لمبے تھے ان کی بیوی فاطمہ بیگم اتنی ہی چھوٹی تھیں۔ ان کا قد تقریباً پانچ فٹ تھا۔ رنگ صاف سفید، آنکھیں اور بال بھورے تھے۔ بسنہ جانا انہیں بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ خیر اس شرط پر وہ جانے کے لیے تیار ہو گئیں کہ ان کے ساتھ ان کی چھوٹی بہن اور ان کا خاوند بھی خواجہ غلام محمد بٹ جائیں گے۔ اس طرح بسنہ میں دو کشمیری خاندان پہنچ گئے۔ دانی خاندان والوں کو بڑے بابو اور بٹ خاندان والوں کو چھوٹے بابو کہا جانے لگا۔ چھوٹے بابو کو بھی زمینیں دے دی گئیں لیکن کاشت کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے بٹ خاندان کے لوگ چرم اور سوت کی تجارت میں مشغول ہو گئے۔ خواجہ غلام محمد کے دو بیٹے تھے۔ اُن دونوں نے امرتسر میں دو بہنوں سے شادی کر لی۔ ان کے دو سالے غلام یاسین اور محمد یوسف بھی امرتسر سے بسنہ پہنچ گئے۔ اس طرح تیسرا کشمیر خاندان بسنہ آ گیا۔ آخر میں اُن کی ایک سالی اور ان کا خاوند مرزا محمد صالح بھی بسنہ پہنچ گئے اور چوتھے کشمیری خاندان کا وہاں اضافہ ہوا۔ اسی طرح خواجہ صاحب کے لڑکے کے سالے کا سالا امیر الدین صاحب امرتسر سے وہاں پہنچ گئے اور وہیں شادی کر لی۔ یہ آخری فرد کشمیر کا وہاں پہنچا۔

غلام رسول دانی شوخ طبیعت کے آدمی تھے۔ انہوں نے بسنہ میں بھی ایک تانگہ بنوایا اور دو گھوڑے خریدے۔ ایک سفید اور دوسرا سرخ رنگ کا۔ ان پر سواری کر کے گاؤں میں سیر کیا کرتے اور اپنی شان و شوکت کی نمائش کرتے تھے۔ نہ انہیں کاشتکاری کا شوق تھا اور نہ ہی تجارت سے

دلچسپی۔ یہاں آ کر شکار کی لت پڑ گئی تھی۔ اپنے ساتھ ہمیشہ دو نالی بندوق رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بھری ہوئی بندوق ملازم اٹھا کر چل رہا تھا کہ یکا یک اس کا ہاتھ بندوق کے گھوڑے پر دبا اور گولی چل گئی اور میرے دادا کے منہ پر لگی۔ بڑی مشکل سے وہ بچ تو گئے لیکن اس کا اثر ان کی صحت پر بہت ہوا۔ وہ پہلے ہی گرم مزاج تھے۔ اس حادثے کے بعد وہ اور بھی گرم مزاج ہو گئے اور سب پر گرمی کھانے لگے۔ وہ ہمیشہ اپنی بیوی سے لڑتے اور اپنے بڑے لڑکے یعنی میرے والد صاحب کے ساتھ ان کی ہمیشہ لڑائی رہتی۔

بڑے لڑکے غلام نبی دانی کی شادی کم عمری میں ہی امرتسر میں دار خاندان کی ایک لڑکی شریف بیگم کے ساتھ ہو گئی وہ بھی اپنے بھائی محمد حسین بٹ کو اپنے ساتھ بسنے لے کر گئیں۔ انہیں زمینیں دلوائیں اور وہیں ٹرکاری (ترکی) خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی۔ غلام نبی دانی نے اپنے لیے ایک گھر بنوایا اور گھر کے نزدیک ایک چھوٹی مسجد بھی تعمیر کی۔ یہ مسجد اور گھر چھوٹے بابو کے متصل تھا۔ نمازِ جمعہ کے لیے لوگ پھر بھی سب پرانی مسجد جایا کرتے تھے جسے لوگ بڑی مسجد کہا کرتے تھے۔ غلام نبی دانی نے انہیں چھوٹے بابو کی تقلید کر کے چرم اور سوت کی تجارت کرنا شروع کی۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اُردو جانتے تھے۔ غلام نبی نے پہلے اپنے چھوٹے بھائی غلام جیلانی کو اپنے ساتھ تجارت میں لگایا۔ جب یہ بھائی بڑا ہوا تو اس نے اپنی دکان خود کھول لی۔ پھر غلام نبی نے اپنے ایک اور بھائی محمد سکندر کو اپنے ساتھ لگایا اور اپنے سب سے بڑے لڑکے غلام مرتضیٰ کو تجارت میں شریک کیا۔

جون 1919ء میں احد جو دانی فوت ہو گئے۔ انہیں بڑی مسجد کے قریب دفن کیا گیا۔ ان کے کتبے قبر کی دیوار میں لگائے گئے۔ اس طرح بڑی مسجد کے باہر کا میدان کشمیریوں کا قبرستان بن گیا لیکن یہاں مقامی مسلمان دفن نہیں ہوتے تھے۔ ان کے لیے دوسرا قبرستان گاؤں سے باہر عید گاہ کے نزدیک مخصوص کیا گیا وہیں میمن مسلمان بھی دفن ہوتے تھے۔

غلام رسول اور فاطمہ بیگم سے چھ بیٹے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی چاند بیگم نے شادی سے پہلے ہی وفات پائی۔ دوسری لڑکی زہرا بیگم کی شادی غلام رسول دانی نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن دانی کے بڑے بیٹے عبدالحمید دانی سے کر دی وہ سب امرتسر میں ہی

اپنی آبائی حویلی میں رہتے تھے۔شادی کے بعد وہ بھی بسنہ آ گئے اور انہیں بھی ایک گاؤں جہیز میں دے دیا گیا۔اُن کے والد پھر بھی امر تسر میں رہے اور وہیں نمک منڈی میں اپنے چھوٹے لڑکے محمد تسرور کے ساتھ تجارت کرتے رہے۔جب 1919ء میں جلیان والا باغ کا تاریخی حادثہ ہوا وہ بھی اسی باغ کے جلسہ میں شریک تھے لیکن کسی طرح بھاگ کر بچ نکلے۔

ادھر غلام رسول دانی نے اپنے تیسرے لڑکے غلام حسین دانی کو بسنہ سے علی گڑھ پڑھنے کے لیے بھیجا۔وہاں وہ اورینٹل کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن جب 1919ء میں خلافت تحریک شروع ہوئی اور انگریزی کالج کو چھوڑنے کی مہم چلی تو غلام حسین بھی علی گڑھ چھوڑ کر بسنہ واپس آ گئے اور بہت لوگوں کے اصرار کرنے پر بھی وہ انگریزوں کی ملازمت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔غلام رسول دانی نے اپنے دو بیٹوں غلام جیلانی اور غلام حسین کی شادی اپنی سگی بہن خدیجہ بیگم کی دو لڑکیوں زینت بیگم اور سلیمہ بیگم کے ساتھ کر دی۔

چھوٹے لڑکے محمد سرور کی شادی اُڑیسہ کے شہر پدم پور میں آباد ایک ترکی النسل خاندان کی لڑکی کے ساتھ کر دی۔پانچویں لڑکے سکندر کی شادی اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی لڑکی اقبال بیگم کے ساتھ کر دی اور وہ امر تسر سے بسنہ آ گئی۔سب سے چھوٹے لڑکے غلام محی الدین کی شادی نووارد کشمیری مرزا صالح محمد کی لڑکی حمیدہ بیگم کے ساتھ 1930ء میں بسنہ میں قرار پائی۔اس طرح دانی خاندان بسنہ میں پھیلتا گیا۔

جب 1919ء میں احد جو دانی فوت ہوئے۔ایک دفعہ پھر وہاں کے گونڈ راجا کے ساتھ عدالت میں جھگڑا شروع ہو گیا۔غلام رسول دانی کو زمین کے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔اُن کا بڑا لڑکا غلام نبی دانی زمین اور پیسوں کے بارے میں بہت مستعد تھا۔اس نے رائے پور جا کر ایک وکیل کے پاس سارا قصہ بیان کیا۔اس وکیل کا نام پنڈت روی شنکر شکلا تھا جو بعد میں کانگرس کی حکومت میں اس صوبہ کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔پنڈت جی اس وقت سے لے کر آخیر تک ہمارے خاندان کے وکیل متواتر رہے۔یہ مقدمہ کافی عرصہ تک چلتا رہا اور اس کا فیصلہ 1928ء-1929ء میں سنایا گیا۔اس فیصلہ کے مطابق صرف 13 گاؤں ہمارے خاندان کے پاس رہ گئے اور باقی سب گونڈ راجہ کے سپرد کر دیئے گئے چونکہ یہ فیصلہ وکیل صاحب کے ذریعہ ہوا

تھا اس لیے اس کے کاغذات مکمل طور پر تیار ہوئے اور زمین کا محفوظی اور موروثی حق غلام رسول دانی کے نام کیا گیا۔

میرے والد اور بہن بھائی

غلام نبی دانی کے گیارہ بچے بسنہ میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے تین لڑکیاں عائشہ بیگم' تاج بیگم اور حاجرہ بیگم ہوئیں۔ سب سے پہلا لڑکا غلام مرتضٰی دانی دو اکتوبر 1912ء میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد دوسرا لڑکا غلام حیدر پھر ایک لڑکی حمیدہ بیگم ہوئی۔ میں ان کا تیسرا اور آخری لڑکا (بیٹا) تھا جو 20 جون 1920ء میں پیدا ہوا اس کے بعد چار لڑکیاں اور ہوئیں۔ ان میں سے ایک پیدا ہونے کے کچھ روز بعد مر گئی۔ حمیدہ بیگم نے بھی جلدی وفات پائی۔ ایک اور لڑکی رضیہ بیگم سات سال کی عمر میں فوت ہوئی۔ اس طرح تین بڑے اور دو مجھ سے چھوٹی زاہدہ بیگم اور عابدہ بیگم حیات رہیں۔

میں بنام احمد حسن ابھی پیدا ہی ہوا تھا کہ غلام نبی دانی کو اپنی سب سے بڑی لڑکی عائشہ بیگم کی شادی کی فکر ہوئی۔ میری عمر قریب چھ ماہ کی تھی۔ ہم سب بذریعہ ریل امرتسر کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ میری زندگی کا سب سے پہلا سفر تھا جو اپنے والدین کے ساتھ تین دن اور تین رات میں طے کیا۔ اس کے علاوہ بسنہ سے نزدیک ترین ریلوے اسٹیشن رائے پور جانا اس وقت معمولی بات نہیں تھی۔ کوئی بس یا موٹر گاڑی نہیں چلتی تھی۔ بیل گاڑی کے ذریعہ 84 میل کا سفر تین روز میں طے کیا۔ راستہ میں چھتیس گڑھ کے گھنے جنگل سے گزرنا پڑا۔ وہاں اس وقت شیر' چیتے' ریچھ اور بندر عام پائے جاتے تھے۔ راستہ بھر آگ جلانا پڑتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ راستہ کیسے طے ہوا۔ اس قسم کی دو اور شادیاں میں نے اپنی آنکھوں سے امرتسر میں دیکھیں۔ وہاں ہم جا کر کئی مہینہ گزارتے تھے۔ اس کے درمیان بھی آنا جانا لگا رہتا تھا اور میں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث ہمیشہ اپنی والدہ کے ساتھ یا اپنی بہنوں کے ساتھ امرتسر جایا کرتا تھا اور انہی کے گھر وقت گزارا کرتا تھا۔ یہ میری زندگی میں سفر کا آغاز تھا جو آج تک جاری ہے۔ اس سفر کی وجہ سے میرے بچپن پر دو اثر اور پڑے پہلا امرتسر کی زندگی کا اور دوسرا بسنہ گاؤں کی فضا کا۔ ان دونوں کے نقوش کی میری

شخصیت پر چھاپ ہے۔

میری سب سے بڑی ہمشیرہ عائشہ بیگم کی شادی میرے والد کی پھوپھی شاہ بیگم کے سوتیلے لڑکے احمد حسین بٹ کے ساتھ ہوئی۔ یہ حکیم محمد جان بٹ کی پہلی بیوی سے پیدا ہوئے تھے۔ شاہ زما بیگم میرے پردادا غفار جو کی تیسری بیوی کی لڑکی تھی۔ اس طرح اب وائیں خاندان کی لڑکیاں بٹ خاندان میں جانے لگیں۔ میری دوسری بہن تاج بیگم کی شادی حقاق (یعنی عقیق اور زیورات کے سوداگر) خاندان میں خواجہ عبداللطیف کے ساتھ 1929ء میں ہوئی جو امرتسر میں تھے۔ بہن ہاجرا بیگم کی شادی بھی انہی کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرؤف کے ساتھ ہوگئی۔

امرتسر میں بچپن

امرتسر میں میرا وقت کبھی اپنی پردادی سعیدہ بیگم کی حویلی نمک منڈی میں یا اپنے نانا کی حویلی فرید چوک میں یا پھر اپنی بڑی بہن کے پاس مہاسنگ کٹڑاے میں گزرتا تھا۔ میری پردادی (جنہیں ہم سب پنجابی میں سدودادی کہتے تھے) مجھے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ انہی کے پاس میں زیادہ وقت گزارتا تھا۔ گلی میں کھیلتا اور وہاں کی ہندو عورتوں کے سامنے چھلانگیں مارتا تھا۔ یہ عورتیں سویٹر بنتیں یا پھر بادام، تربوز اور خربوزے کے بیج سے ان کی مغز نکالتی تھیں۔ میں ان کے دھاگے کو لے کر دور بھاگتا یا پھر مغز کو چپکے سے لے کر کھا جاتا تھا۔ پھر یہ ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے میرے پیچھے بھاگتی تھیں اور میں اپنے ننھے ننھے پیروں کے بل کودتا پھاندتا پردادی کی گود میں جا کر سانس لیتا اور شکایت کرتا کہ ہندوانی عورتیں مجھے پیار تو کرتی ہیں لیکن مارتی بھی ہیں۔ وہ بڑی کنجوس ہیں اگر میں دو چار دانے کھا بھی لوں تو ان کا کونسا زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ پھر دادی میری ٹوٹی پھوٹی باتوں کو پیار سے سنتیں۔ ماتھے کو چومتیں اور کہتیں کہ وہ مجھے بادام خرید کر دیں گی۔ میوہ بھی کھلائیں گی۔ مجھے ان عورتوں کی کیا پرواہ۔ کبھی میں اپنے نکر کے دونوں جیب میں میوہ اور بادام بھر کر باہر نکلتا اور ان عورتوں کو دکھا دکھا کر کھاتا۔ انہیں منہ بنا کر چڑاتا۔ ان کے منہ میں میوہ ڈالنے جاتا اور پھر چھین کر دور بھاگ جاتا۔ وہ عورتیں مجھے بہت کوستیں اور کبھی پیار و محبت

سے گود میں اٹھا لیتیں۔ یہ ایسا پرسکون اور پرلطف ماحول تھا جس میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ہم سب اسی بہانے ایک دوسرے کے قریب آتے اور آپس کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ یہاں ہم اس برتاؤ میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہیں کرتے تھے۔ زبان بھی ہم ایک ہی بولتے تھے۔ میں نے اپنی پردادی کو ان سے گھنٹوں اپنے گھر کی باتیں کرتے سنا۔ اسی فضا میں ان کے لڑکے عباداللہ نے بہت بعد میں گرومکھی پڑھنا شروع کیا اور انہوں نے گیانی کا امتحان پاس کیا۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں امرتسر میں سخت بیمار ہوا۔ میری عمر پانچ چھ برس کی تھی۔ اپنی پردادی کے پاس ہی رہتا تھا۔ دوا دارو کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا یا اس کا انہیں تجربہ نہیں تھا۔ مجھے دست لگ گئے اور بخار بہت زیادہ ہوگیا۔ گلی کی عورتیں مجھے چھوتیں' پیار کرتیں اور کہتیں آؤ اور ہمارے ساتھ گلی میں کھیلو۔ ہم تم کو بادام کھلائیں گے۔ تمہارے لیے سویٹر بنیں ہیں۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں گے۔ اس طرح وہ مجھے پیار سے تسلی دیتیں۔ کوئی ڈاکٹر کے پاس مجھے لے کر نہیں گیا۔ حکیم نے نبض دیکھ کر دوا دارو پلائی اور میں آہستہ آہستہ ٹھیک ہوگیا۔ والدہ صاحبہ کو اطمینان ہوا اور پھر مجھے اپنے والد کے پاس لے گئے۔

کبھی میں اپنا وقت مہاسنگ کٹڑے میں گزارتا تھا۔ یہاں میں حکیم محمد جان صاحب کے گھر اپنی بڑی ہمشیرہ کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کا صرف ایک ہی لڑکا تھا جن کا نام مسعودالحسن بٹ تھا۔ وہ مجھ سے چند سال چھوٹا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنے ایک رشتہ دار کی ایک لڑکی اپنے گھر پال رکھی تھی جس کا نام اختر بیگم تھا۔ وہ تقریباً میری ہم عمر تھی۔ اس کی شادی بعد میں فرحت اللہ صاحب کے ساتھ ہوگئی لیکن بچپن میں ہم دونوں بہت کھیلتے تھے۔ چرخے کی ڈولی کے ذریعے کنویں سے پانی نکالتے تھے۔ ایک دوسرے پر پانی پھینکتے اور خوب کپڑے گیلے کرتے۔ کبھی ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی میں چھلانگیں لگاتے اور کبھی اوپر سے نیچے راہگیروں پر پانی پھینکتے۔ بس اب تو مصیبت آن پڑتی۔ یہ کون پانی پھینک رہا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے کونے میں چھپ جاتے۔ پھوپھی ہماری دور سے ہی آوازیں دیتی شور مچاتی ہوئی ہمارے پیچھے بھاگتیں اور کہتیں کہاں تم لوگ چھپے ہوئے ہو۔ جب وہ دوسرے کمرے میں جاتیں تو ہم بھاگ کر گلی میں اُتر جاتے اور اگر

پکڑے جاتے تو اختر کو مار پڑتی اور وہ مجھے کوستیں۔ پھر کچھ دیر ہماری ان بن رہتی۔ دوسرے روز ہم پھر مل جل کر کھیلتے اور ہنسی مذاق کرتے۔

اسی اثناء میں ایک روز جب ہم کھڑکی میں دوڑ رہے تھے کہ میری ہمشیرہ کا لڑکا مسعود الحسن بٹ کھڑکی سے گر کر گلی میں اپنی ٹھوڑی کے بل آ پڑا۔ اُسے بڑی چوٹ آئی۔ دونوں جبڑے جڑ گئے۔ حکیم صاحب کا یہ چہیتا پوتا تھا۔ اس وقت مسعود کے والد فوت ہو چکے تھے۔ حکیم صاحب حکمت کے ماہر تھے اور امرتسر میونسپلٹی کے بڑے حکیم کے عہدہ پر فائز تھے لیکن اپنے پوتے کے لیے وہ کچھ نہیں کر پائے۔ ساری عمر کے لیے مسعود الحسن کا گلاب جیسا چہرہ بگڑ گیا۔ صرف منہ ان کا کھل گیا اور وہ بمشکل کھانا کھانے لگے۔ گو کہ مسعود میرا بھانجا تھا لیکن میں اُسے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی۔ کافی وقت وہ میرے پاس گزارتا تھا۔ 1979ء میں وہ ملتان میں فوت ہوا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ والد صاحب امرتسر آتے اور یہیں حکیم صاحب کے گھر آ کر ٹھہرتے۔ صبح صبح وہ مجھے گھر سے باہر لے جاتے' راستہ میں دکان پر دہی کی لسی پیتے' کبھی چھولے روٹی کھاتے۔ کبھی دہی کلچے اور کبھی پوری حلوہ۔ کبھی قتلمہ اور نان خطائی۔ ساتھ لے کر گھر واپس آتے۔ اتنی دیر میں پھوپھی ہمارے لیے نمکین چائے تیار کرتیں اور ہم پیالے پر پیالے بھر بھر کر پیتے۔ چائے چولہے پر پکتی رہتی اور وہ کڑھ کر گلابی رنگ بنا لیتی۔ اس کے اوپر کی سطح میں ملائی جم جاتی۔ یہ چائے سب سے مزیدار ہوتی۔ کبھی والد صاحب کہتے کہ اس میں نمک کم ہے۔ پھر ہمیں سیدھا نمک کا ثابت ٹکڑا دیا جاتا جو ہم چائے میں گھولتے اور مزے لے لے کر پیتے۔ اس کے بعد بھوک لگتی۔ ہمیں ایک یا دو پیسہ ملتے۔ گلی میں جاتے اور اکثر گرمیوں میں شیریں برفانی گولا خریدتے اور چوس چوس کر کھاتے۔ یہ گولا ایک چھوٹی لکڑی کے ایک سرے پر بنا ہوتا۔ یہ اس وقت کی سب سے لذیذ اور ٹھنڈی مٹھائی لگتی۔ کبھی کبھی والد صاحب ہمیں ایک بڑی دکان پر لے جاتے اور وہاں بڑے بڑے پیالے میں فالودہ قلفی کے ساتھ بھر کر کھلاتے۔ یہ دن ہمارے لیے عید کی خوشی کے برابر ہوتا۔

جب کبھی میں اپنے ننھیال کے رشتہ داروں کے گھر فرید چوک میں ہوتا تو وہاں بہت

سے لڑکے گلی میں کھیلنے کے لیے جمع ہو جاتے۔ ایک میرے ہم عمر خواجہ غلام احمد تھے جن کے ساتھ میں اکثر کھیلا کرتا تھا۔ گلی ڈنڈا بھی کھیلتا۔ گولیوں (بنٹے) پر بھی بازی لگتی۔ بال بلے پر زور آزمائی ہوتی۔ ان کے ساتھ اکھاڑے بھی جاتا تھا۔ وہاں ورزش کرتا ڈنڈ پیلتا۔ کشتیاں لڑتا۔ جب کبھی بارش ہو جائے تو گلیوں میں پانی بھر جاتا تھا۔ پھر ہماری موجیں ہوتیں۔ اس پانی میں ہم خوب کھیلتے اور نہاتے۔ غوطے لگاتے۔ ایک دوسرے پر گدلا پانی پھینکتے اور سارے کپڑے گیلے کر کے گھر واپس آتے اور پھر کیا تھا گھر میں امی سے خوب مار پڑتی اور پھر ہم توبہ کرتے۔ کان پکڑتے اور کبھی کبھی زمین پر ناک رگڑتے اور کہتے کہ پھر کبھی گندے پانی میں نہیں کھیلیں گے۔

ایک مرتبہ ہم بہت سے بچے سیر کرتے کرتے پھلوں کے ایک باغ میں پہنچ گئے جہاں ارائیں باغبان رکھوالی کرتے تھے۔ ہمیں کیا سوجھی کہ ہم چپکے سے درخت پر چڑھ گئے اور پھل توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ بڑی میٹھی ناشپاتیاں لگی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایک باغبان ادھر آ نکلا۔ اس نے ہمیں دور سے دیکھ لیا اور دور سے ہی آواز دی اور لوگ بھی آ گئے۔ ہم سب پکڑے گئے۔ اب انہوں نے ہمیں نہیں چھوڑا۔ سارا دن ہم سے کام لیا۔ ٹوکری میں بھر بھر کر پھل جمع کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کھاتے بھی گئے۔ شام کے وقت جب سارا کام ختم ہو گیا تو دو دو چپت لگا کر ہمیں چھوڑ دیا گیا۔ ہم روتے بھاگتے گھر واپس آئے۔ رات ہو چکی تھی چپکے سے گھر کے اندر گھسے۔ ماں نے زور سے آواز دی کہاں تھے سارا دن۔ ہم سے کچھ کہا نہ جائے۔ پھر گھر میں بھی مار پڑی لیکن کھانے کو ملا اور ماں سے لپٹ کر سو گیا۔ مجھے اکیلے سونے میں ڈر لگتا تھا' رات کو اکثر ڈرا کرتا تھا اس لیے ماں کے ساتھ ہی کافی عرصہ تک سوتا رہا۔

میں بچپن میں ایک اور گھر میں جو کہ امرتسر میں ہی تھا رہتا تھا۔ یہ مہذب اور پڑھا لکھا گھرانہ تھا۔ یہ گھر خواجہ غلام محمد کا تھا۔ جو خواجہ عبدالرحیم کے والد اور خواجہ طارق رحیم کے دادا تھے۔ ان کی بیوی کو ہم ماسی کہا کرتے تھے۔ گو کہ وہ میری دادی کی چچیری بہن تھیں۔ ان کا ایک لڑکا غلام مصطفیٰ اور ایک لڑکی اختر قریب میرے ہم عمر تھے۔ ان کا چھوٹا لڑکا غلام مرتضیٰ بعد میں ریڈیو پاکستان میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدہ پر فائز ہوا۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں ڈسٹرکٹ جج تھے۔ کبھی قصور

ہوتے اور کبھی گورداسپور۔ ان کے گھر میں بھی کئی دن گزارتا اور بچوں کے ساتھ کھیلتا لیکن اس گھر میں گستاخی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ خواجہ صاحب اور ان کی بیوی دونوں مجھے بڑی شفقت کی نظر سے دیکھتے اور کشمیری آداب اور طور طریقے سکھاتے۔ تقسیم برصغیر کے بعد جب میری شادی ہوگئی تو میں اپنی بیوی اور بچی کو انہی کی سرپرستی میں لاہور چھوڑ کر مشرقی پاکستان چلا گیا تھا گو کہ یہ خود ملتان روڈ پر شاہ نور سٹوڈیو کے سامنے رہتے تھے اور میری بیوی اچھرہ میں ایک چھوٹے سے مکان میں جو کہ کرایہ پر لے رکھا تھا لیکن خواجہ صاحب اپنے تانگے پر سوار ہو کر وہاں آتے اور اس کی خبر گیری کرتے تھے۔ جب میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر واپس ڈھاکہ سے آیا تو لاہور کے ہوائی اڈے پر خوش آمدید کہنے وہ خود تشریف لائے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 90 سال کی تھی اور میں تیس سال کا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ میں نے ایک طرف استعفیٰ دے دیا ہے اور دوسری طرف ایک اور ملازمت بھی مل گئی ہے۔ میری بیوی مجھ سے ناراض تھی۔ اسے غم تھا کہ ہم کہاں رہیں گے اور کیا کھائیں گے۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے اس لیے وہ ہوائی اڈے نہیں آئی۔ خواجہ صاحب کو میری خودداری پر پورا یقین تھا۔ جب میں نے اپنی نئی نوکری کے کاغذات دیئے وہ بہت خوش ہوئے۔ خواجہ صاحب کے مدبرانہ برتاؤ کا اثر میری زندگی پر بہت ہوا اور مجھے احساس ہوا کہ انگریزوں کے زمانہ میں ایک شریف مسلم خاندان کس طرح اپنے وقار کو برقرار رکھے ہوئے اپنے سرکاری اور نجی فرض ادا کرتے تھے اور کیسے وہ اپنے بچوں کو ترقی کی راہ پر لگاتے تھے۔ اس کی زندہ مثال ان کا اپنا دوسرا لڑکا خواجہ عبدالرحیم تھا جو آخر میں پنجاب کے چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہا۔

امرتسر میں ایک اور خاندان والوں کے ساتھ اپنا بچپن گزارتا تھا۔ یہ میری دوسری بہن تاج بیگم کی شادی کے بعد کی بات ہے۔ چٹے کٹڑے میں ان کے پاس رہنا ہوتا تھا۔ یہ گھر بہت بڑا ہوتا تھا جہاں سارے بھائی اکٹھے مل کر رہتے تھے۔ میرے بھائی جان خواجہ عبداللطیف نے اپنی ریلوے کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ وہ گھر میں ہی بے کار رہتے یا پھر بسنہ جا کر میرے والد صاحب کے ساتھ وقت گزارتے۔ وہ مذہبی رسوم کے بڑے پابند تھے۔ نماز روزہ باقاعدگی کے ساتھ کرتے تھے اور مجھے بھی اپنے ساتھ مسجد لے جاتے۔ انہیں امرتسر شہر کی تاریخ سے بڑی

دلچسپی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر دربار صاحب (Golden Temple) جایا کرتے اور وہاں کے ہر کمرے کی پرانی تاریخ بیان کرتے۔ مجھے وہ کمپنی باغ بھی لے جاتے اور وہاں ٹھنڈے کھوکا ٹھنڈا پانی پلاتے اور گرم گرم پوڑیاں اور چھولے کھلاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دفعہ ہندوؤں کا بڑا تہوار تھا۔ وہ رات کے وقت مجھے مندر لے گئے۔ بڑی خلقت آ جا رہی تھی۔ قدم رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے اندر گئے' باہر آئے۔ انہوں نے اس مندر کا سارا قصہ مجھے سنایا۔ دوسری مرتبہ میں ان کے ساتھ لاہور آیا۔ داتا صاحب کی درگاہ میں حاضری دی۔ انہوں نے تمام تاریخی مقامات مجھے دکھائے اور تفصیل سے ان کے متعلق بتایا۔ پھر واپس امرتسر آ گئے۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال ہوگی۔ اس گھر میں ان کا ایک بھتیجا اسلم بے ہوا کرتا تھا۔ جس کے والد خواجہ عبدالرشید صاحب بڑے سخت آدمی تھے۔ اسلم کے ساتھ میں گلیوں میں بھاگتا پھرتا اور بازاروں میں گھومتا تھا۔ دوستوں کی بڑی ٹولی بن جاتی تھی لیکن ہم شرارت سے باز نہ آتے تھے۔ اس ٹولی میں ہندو' سکھ اور مسلم لڑکے شامل ہوتے تھے۔ بعد میں اسلم صاحب نے میری بھانجی فیروزہ بیگم کے ساتھ شادی کی۔ انہوں نے پاکستان ایئر فورس کے شعبۂ قانون میں ملازمت کی اور ایئر کموڈور ہو کر ریٹائر ہوئے۔ یہ سارے شہری رسومات میری زندگی کا حصہ بن گئے۔ ان کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ بڑے ہو کر کالج کی چھٹیوں میں اکثر آتا تھا اور یہاں وقت گزارتا تھا۔

بسنہ گاؤں کا ماحول

اس کے برعکس میری زندگی پر گاؤں کا اثر بھی بہت زیادہ رہا جہاں میرے والدین رہتے تھے۔ زمین کی کاشت پرانے ڈھرے پر کرتے تھے اور ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے میں نہ وہاں کوئی ہسپتال تھا اور نہ کوئی خاص زچگی کا انتظام۔ اللہ توکل گھر میں ہی بچے پیدا ہوتے تھے۔ گھر کی عورتیں ہی اپنے تجربے کے مطابق دیکھ بھال کرتی تھیں اور گھر کے آنگن اور محلے صاف کرنے والی عورت جسے ہم گھسن کہتے تھے مدد کرتی اور ماں زچگی والی ماں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ میں بھی اسی حال میں اس گاؤں میں پیدا ہوا اور ماں

کا ہی دودھ پیتا رہا۔لیکن یہ کافی نہیں تھا۔گھر میں پانی بھرنے والی عورت جوٹر کاری (ترکی النسل) تھی اور جس کا نام پیلی تھا اور اس کا دودھ بھی میں پیتا تھا۔اس سے بھی جب مجھے تسلی نہ ہوتی تو میرا منہ بکری کے دودھ والے تھن میں لگا دیا جاتا اور میں اس کا دودھ میزے سے پیتا تھا۔جب تھوڑا بڑا ہوا تو ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے پراٹھے چلتے۔(چاول کی روٹی جسے مدراس میں روسا کہتے ہیں) انڈے یا نمکین چائے کے ساتھ کھانا شروع کیا۔ بھائیوں میں بڑی لڑائی ہوتی کہ کون سب سے پہلے کھائے گا۔چھوٹے ہونے کی وجہ سے میرے لیے رعایت تھی اور پہلے مجھے دیا جاتا تھا۔ہم اکثر والد صاحب کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔دن کو روٹی اور رات کو عموماً ابلے چاول کھاتے تھے۔جب سکول جانے لگا تو پراٹھے کو دودھ میں بھگو کر نرم کرتا اور پھر چینی ملا کر کھاتا تھا۔ عورتیں اکثر بعد میں کھاتی تھیں۔ماں یا بہنیں گرم گرم روٹی پکاتی تھیں۔اکثر میں دوبارہ ماں کے ہاتھوں دو تین نوالے کھاتا تھا۔

میرے والد بڑی محنت کرتے تھے۔صبح سویرے گھر کے سامنے نوکروں کی قطار لگی ہوتی تھی۔انہیں (Head Man) کے ذریعے حکم دیتے اور کام پر روانہ کرتے تھے۔گھر کے نزدیک کوٹھے میں گائے، بیل، بھینسیں اور بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔راوت ان کا خیال رکھتا تھا۔صبح دودھ دوہ کر گھر کے اندر پہنچتا تھا اور پھر جانوروں کو چرانے باہر لے جاتا تھا۔شام گئے دھول اُڑاتے، گاؤں کی کچی گلیوں سے گزرتے، بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹی کی آواز دھیمی کرتے واپس آتے۔ناشتہ کرنے سے پہلے ہی میرے والد دکان کے تخت پر بیٹھ جاتے اور اپنا بہی کھاتا سنبھال لیتے۔تجارت کا سامان گاڑی پر لاد کر بازار کے لیے روانہ کر دیتے تھے۔پھر چائے پینے کے بعد کبھی پیدل اور کبھی سائیکل پر سوار ہو کر کھیت کی طرف روانہ ہو جاتے تھے۔دوپہر کا کھانا گھر میں آ کر کھاتے تھے اور شام کا کھانا سورج غروب ہوتے ہی کھا لیتے اور اپنے بستر پر لیٹ جاتے۔ میں ان کے پیٹ پر سوار ہو جاتا اور وہ مجھے ایک دو تین کی گنتی منہ زبانی سکھاتے۔جیسے جیسے میں بڑا ہوا نمبروں کو جمع تقسیم، ضرب وغیرہ سب مجھے یاد ہو گئے۔کبھی کبھی صبح شام جب وہ بہی کھاتا میں حساب کرتے تو مجھے جلدی جلدی جمع اور تفریق کرنے کا حکم دیتے تھے۔یہ سب میں منہ زبانی کرنا سیکھ گیا تھا۔اس طرح بچپن میں ہی حساب پر میری دسترس ہو گئی۔

اب بسنہ گاؤں میں کشمیری خاندان کے بچوں کی تعداد کافی ہوگئی۔ ہمیں کھلانے کے لیے گھر میں نوکر نوکرانیاں ہوتی تھیں۔ یہ اکثر تُرکاری خاندان کے یا مقامی لوگ ہوتے تھے۔ ان کے کاندھوں پر سوار ہوکر ہم گھر سے باہر جاتے۔ ایک دوسرے بچوں سے ملتے اور ان کے ساتھ کھیلا کرتے۔ کبھی ماں اور بہنوں کے ساتھ دوسرے رشتہ داروں کے گھر جاتے۔ عورتوں پر پردے کی پابندی بڑی سخت ہوتی تھی۔ ہماری اپنی عورتیں بند گاڑی میں بیٹھتی تھیں۔ اس کے سامنے پردہ ڈھکا ہوتا تھا۔ ان بیل گاڑیوں کو آدمی کھینچتے تھے۔ اس طرح وہ نقل وحرکت کرتی تھیں۔ اس میں سفر صرف کشمیری عورتیں کرتی تھیں۔ مقامی عورتیں کھلے عام آتی جاتی تھیں۔ کوئی کوئی عورت برقعہ بھی پہنتی تھی۔ میں اکثر اپنی والدہ کے ساتھ چلا جاتا کیونکہ دوسرے رشتہ داروں کے گھر میں پھل، بسکٹ، شیرنی اور حلواہ وغیرہ کھانے کو ملتا تھا۔ کھیلنے کے لیے بھائی بہن تو تھے ہی۔ اکثر ہم ایک دوسرے سے لڑتے، مار پیٹ کرتے، ایک دوسرے کے بالوں کو کھینچتے اور پھر ماں کے سامنے معافی مانگتے۔ خاص کر میرے گھر کے نزدیک میرے ماموں رہتے تھے اور ان کے ساتھ ہی چھوٹے بابو کے خاندان کے بہت سے بچے تھے۔ ان کے گھر اکثر جاکر میں ہم عمر بچیوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور خاص طور پر ایک لڑکا محی الدین کے ساتھ بہت دوڑ لگاتا تھا۔ جب بوڑھے بٹ صاحب خواجہ غلام محمد کی کشمیری بیوی فوت ہوگئی تو انہوں نے نزدیک کے گاؤں سے ایک تُرکاری لڑکی سے شادی کرلی۔ ان سے ایک لڑکا قمرالدین پیدا ہوا جو قریب میرے ہم عمر تھا۔ اس کے ساتھ میری دوستی تھی۔ ہم دونوں اکٹھے گاؤں کے سکول جاتے تھے اور باقی وقت میں خوب کھیلتے تھے۔ ان کی امی کو میں نانی کہتا جو ہمیں بہت پیار کرتی تھیں۔ بدقسمتی سے یہ لڑکا جلدی فوت ہوگیا۔

ہند میں اب کشمیریوں کی تعداد کافی بڑھ گئی تھی۔ یہ سب کشمیری شکل وصورت میں مقامی لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ پہناوہ علیحدہ، کھانا پینا بھی مختلف، زبان زیادہ تر پنجابی لیکن مقامی چھتیس گڑھی زبان جسے لرید کہتے تھے اس کا استعمال بھی ان میں عام تھا۔ شادی بیاہ آپس میں کرتے یا پنجاب یا کشمیر جاکر رشتہ کرتے۔ خاص طور پر لڑکیاں کبھی یہاں شادی میں نہیں دیتے تھے۔ لیکن مقامی عورتیں ضرور لی جاتی تھیں۔ یہی حالت اور کشمیریوں کی ہوتی جو کشمیر سے نکل کر دوسرے شہر میں اپنے محلے قائم کرتے۔ کشمیری اپنے آپ کو ہمیشہ کشمیری کہلاتا ہے چاہے اس نے

کشمیر دیکھا بھی نہ ہو۔

ان کشمیریوں کے علاوہ بندگاؤں میں دوسرے لوگ بھی آباد تھے جو دُور دُور صوبوں سے یہاں آئے تھے۔ اوپر کچھی میمن کا ذکر ہو چکا ہے' یہاں سکھ بھی آ پہنچے جو سود میں روپیہ لگاتے تھے۔ لیکن یہ مستقل طور پر نہیں رہتے تھے۔ فصل کاٹنے کے وقت پنجاب سے آجاتے اور سود وصول کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ اصل مقامی باشندے چھوٹے چھوٹے کاشتکار اور دوسرے پیشے میں مشغول تھے۔ راوٹ بھی جواہیروں کی طرح جانوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک پورا محلہ پنکوں کا تھا جو کبیر پنتھی تھے۔ تیسرا محلہ بنجاروں کا تھا جو بالکل ہی مختلف تھے۔ ان کی زبان بنجارا تھی۔ عورتیں لہنگے پہنتی تھیں اور ان کی چولیوں میں شیشے کا کام ہوتا تھا۔ ان پر رنگ برنگے ڈیزائن بنے ہوتے تھے۔ یہ گدھوں پر سامان لاد کر بازار بازار تجارت کرتے تھے۔ ثقافتی لحاظ سے ان کا تعلق سندھ سے اور گجرات کے قدیم لوگوں سے تھا۔ شاید یہ ان سوداگروں کی اولاد ہوں جو موہنجوڈارو سے نکل کر دُور افتادہ جگہوں میں مال واسباب فروخت کرنے کا کام کرتے رہے ہوں۔

اس کے علاوہ سب سے نیچ قوم چمار اور گھیار کی تھی۔ جو گاؤں کی حدود سے باہر رہتے تھے۔ چونکہ میرے والد چرم کی تجارت کرتے تھے' چمار ان کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ایک اور طبقہ مزدوروں کا تھا جن میں گونڈ اور بہت سی اڑیسہ اقوام شامل تھیں۔ یہ یہاں کے اصلی باشندے تھے جو نسلاً بالکل ہی مختلف تھے۔ گونڈوں کی شکل جنوبی بہار کے رہنے والی قدیم ترین آبادی سے ملتی جلتی تھی۔ ان کی خوراک میں چاول' مچھلی اور دیگر اقسام کے کیڑے مکوڑے شامل تھے، لیکن ان کی ثقافت پر اڑیسا لباس کے رہن سہن کے طریقوں کا بڑا چرچا تھا۔ یہاں تھوڑے سے دھوبی' نائی' کمہار اور ایک نیپالی نسل کا درزی بھی تھا۔ سرکاری ملازم بہت کم تھے۔ یہاں ایک پولیس تھانہ تھا۔ ایک پرائمری سکول جو میرے زمانے میں ہندی مڈل سکول بن گیا۔ گاؤں کا انتظام پنچائیت کے ہاتھ میں تھا جس کے سرپرست (سرپنچ) میرے والد صاحب تھے۔ بعد میں مسلمانوں نے ایک اُردو مدرسہ بھی یہاں قائم کیا۔ باہر سے جب کبھی تحصیلدار یا ڈپٹی کمشنر یہاں دورے پر آتے وہ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرتے تھے' لیکن ان کے کھانے پینے کا سارا انتظام میرے

والد صاحب کرتے تھے۔

گھر میں قواعد بڑے سخت تھے۔ شام کے بعد کسی کو باہر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ گاؤں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ہم شام ہی کو سو جایا کرتے تھے۔ اس سختی کا بڑا اثر میری زندگی پر پڑا۔ ایک طرف تو میں قاعدوں کا پابند ہو گیا۔ والدہ صاحبہ مجھے لوریاں سناتیں۔ پنجابی میں گیت گا کر پیار کرتیں۔ ہیر رانجھا اور بلھے شاہ کے نغمے بڑے سریلے لگتے۔ درد بھری آواز میں کافی میرے دل پر بڑا اثر کرتی۔ کبھی کشمیری کے دو چار الفاظ بھی میرے کانوں میں ڈالتیں لیکن زیادہ تر مجھ سے یہاں کی مقامی زبان چھتیس گڑھی میں ہی باتیں کرتیں۔ گھر کے باہر بھی اسی زبان کو نوکر بھی استعمال کرتے تھے۔ بہت سے لوگ یہاں اُڑیا بولتے اور یہ زبان بھی میرے کانوں تک پہنچی۔ سکول میں ہندی پڑھنا شروع کیا لیکن امرتسر میں اردو پڑھتا تھا۔ گاؤں میں کچھی میمن کی وجہ سے گجراتی بول چال تجارتی طبقہ میں استعمال ہوتی تھی۔ میرے والد اور بڑے بھائی صاحب گجراتی کافی اچھی طرح بول لیتے تھے۔ ان ساری زبانوں کو میں مختلف نہیں سمجھتا تھا۔ میرے لیے وہ ساری زبانیں ایک ہی تھیں۔ میرے لیے ایک کو دوسرے میں بدلنا اتنا آسان تھا جیسے ایک جملہ کو دوسرے جملے میں خیالات کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اس طرح کئی زبانوں کی بنیاد بچپن سے ہی میرے دماغ میں پڑ گئی۔

بسنہ میں گھر سے باہر اپنے نوکروں کو دیکھتا تھا۔ ان میں زیادہ تر گونڈ اور اُڑیا لوگ ہوتے تھے جو بہت ہی غریب تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی زمین ہوتی نہ گھر سوائے اس کے کہ جو میرے والد صاحب نے انہیں دیا تھا۔ ان کا لباس بہت معمولی تھا۔ مرد سوتی کپڑے کی دھوتی کمر میں باندھ لیتے تھے جو گھٹنے تک جاتی تھی۔ دوسرے کپڑے کو یہ گمچھا کہتے تھے جو اکثر بدن کے اوپر حصہ پر ڈال دیا جاتا تھا یا پھر سر پر ڈال دیتے تاکہ دھوپ سے سر بچ جائے۔ عورتیں ایک ہی رنگین کپڑے سے بدن کو اس طرح ڈھانپتیں کہ کمر پر لپیٹ کر مخصوص حصے کو چھپا لیتیں۔ وہ بھی گھٹنے تک رہ جاتا تھا۔ ان کے پاس بلاؤز نہیں ہوتا تھا لیکن اندرون حصہ کو پٹکے سے چھپا رکھتی تھیں۔ جوتے پہننے کا رواج نہیں تھا۔ عورتیں بالوں پر سرسوں کا تیل ملتی تھیں اور کنگھی سے بالوں کو سنوارتی تھیں۔

گھر کے سارے نوکر ایک قسم کے غلام تھے۔ وہ نوکری چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں نقد رقم کچھ بھی نہیں ملتی تھی۔ کھانے کے لیے سال میں کچھ دھان دے دیا جاتا تھا۔ کچھ سبزی اور پیاز خود اُگاتے تھے اور اسی میں گزارہ کرتے تھے۔ میوے سے شراب بناتے اور جب بھی موقع لگتا اسے پی کر اپنی عورتوں کے ساتھ سو جاتے تھے۔ عورتیں بہت کام کرتی تھیں۔ گھر میں اور کھیت میں بھی۔ خاص کر دھان کاٹنے اور کوٹنے کا کام ڈھیکی میں کرتی تھیں۔ (چھاج) سوپے سے دھان کو صاف کر کے چاول بھی نکالتی تھیں۔ سیلا چاول زیادہ تر کھاتی تھیں۔ اس کو پانی میں بھگو کر رکھتیں اور پکا کر اس کا لپیا یعنی مایا نکال کر پیتی تھیں۔ میں کبھی اپنے نوکر کے ہمراہ کھیت چلا جاتا تھا اور وہاں عورتوں کو اپنے مردوں کے لیے ایک ہانڈی میں کھانا لاتے دیکھتا۔ ہانڈی میں پانی سے بھرا بھات ہوتا جو نمک اور پیاز کے ساتھ کھا لیا جاتا تھا۔ سبزی نادر ہی ان کے نصیب میں ہوتی تھی۔ سارا دن دھان کے کھیت میں پانی سے بھرے پودوں کے بیچ کام کرتے تھے چونکہ اس وقت مشینیں نہیں ہوتی تھیں، خود ہاتھ سے بیلوں یا بھینسوں کے ذریعے ہل چلاتے (جوتتے) تھے۔ کدال اور رنبا سے مٹی کھودتے اور ہنسیے سے دھان کاٹتے تھے۔ کبھی کبھی کھیت میں مچھلیاں پکڑ لیتے اور تھوڑا سا اپنی عورتوں کو پکانے کے لیے دے دیتے تھے۔ آخر میں Store کوٹھار میں دھان کے کھیت جمع کیے جاتے تھے۔ ان کو بیلوں سے روند کر دھان نکالتے اور اس طرح اپنے مالکوں کی خدمت کرتے تھے۔

جب میں تھوڑا بڑا ہوا تو انہی کے بچوں کے ساتھ گلیوں میں کھیلنا شروع کیا۔ کشمیری مالگذار جنہیں وہ سب مالک کہتے تھے۔ ان کے لڑکے ہونے کی وجہ سے میرا خوف ان پر طاری رہتا تھا۔ میرا وہ خاص خیال رکھتے تھے اور مجھے وہ گونٹیا کے بابو کہہ کر پکارتے تھے۔ میں ان کی پرواہ نہیں کرتا تھا کیونکہ مجھے کھیلنے کے لیے ساتھی کی ضرورت تھی۔ میں ان کے ساتھ گولیاں کھیلتا تھا۔ گلی ڈنڈا، کبڈی اور دوڑ بھاگ کرتا اور اتنا گھل مل جاتا کہ مجھ میں اور اُن میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تھا۔ کبھی کھیلتے ہوئے مٹی سے اتنا جسم اور کپڑے بھر جاتے کہ گندے ہاتھوں گھر آتا اور میری ماں مجھے یاد دلاتی کہ مجھے ان بچوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہیے۔ مجھے بڑا آدمی بننا ہے۔ میں اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتا تھا۔ میں کبھی ان بچوں کو اپنے گھر لے آتا اور ماں سے انہیں کھانا دینے کو کہتا۔ میری

ماں ان سے کچھ کام لے کر انہیں کچھ کھانے کو دے دیتی تھیں۔ کبھی میں بھی ان سے چھین کر کھالیتا تھا۔ کتنا مزہ آتا آپس کی برابری میں کبھی چاول کے لڈو یا مرمرے یا کھا جا ساتھ لے جاتا اور کبھی ماں کے چھپائے ہوئے بادام اور کشمش چپکے سے نکال کر جیب میں بھر لیتا اور باہر نکل جاتا تھا اور بانٹ بانٹ کر ہم سب کھاتے تھے۔ بسنہ میں ہمارا ایک بہت بڑا پھل کا باغ تھا۔ ان بچوں کے ساتھ میں وہاں چلا جاتا۔ ان کے ساتھ کبھی جامن کے درخت پر کبھی آم کے اور کبھی امرود کے پھل پر اور کبھی سیتا پھل کے درخت پر چڑھ جاتا اور ہم سب پھل کھاتے تھے۔ گھر کا مالی والد صاحب سے شکایت کرتا اور ہم سب کو ڈانٹ پڑتی تھی۔ والد صاحب اور بڑے بھائی صاحب بچپن میں مجھے مارتے تھے۔ صرف والدہ صاحبہ مجھے پیار سے چھپا لیتیں اور کہتیں کہ آخر یہ بچہ تو ہے۔ اگر پھل کھا لیا تو کیا کمی ہوگئی۔ میں بڑا خوش ہوتا اور اپنے گاؤں کے ساتھیوں کے ساتھ ایسا محسوس کرتا کہ آخر ہم نے بازی جیت لی ہے۔ یار تو یار ہی رہے۔ کھائیں تو اکٹھے کھائیں اور کھیلیں تو اکٹھے۔ آخر وہ میرے بچپن کے ساتھی ہی تھے۔ ہم سب ایک ہی انسان کے بچے تھے۔ (یہ عادت بڑے ہو کر بھی قائم رہی)۔

تہوار ہم اکٹھے ہی مناتے تھے۔ چاہے وہ مسلمانوں کا ہو یا ہندوؤں کا۔ عیدالفطر، عیدالاضحیٰ اور محرم یا ہولی، دیوالی اور دسہرہ سب مل جل کر مناتے تھے۔ عیدگاہ میں نماز پڑھنے صرف مسلمان جاتے۔ اس موقع پر آس پاس کے گاؤں والے سب بسنہ آتے۔ ہم نئے کپڑے پہن کر عیدگاہ جاتے۔ واپس آ کر ان باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے ہمارے گھر میں پلاؤ اور گوشت پکتا اور انہیں کھلایا جاتا تھا۔ نوکروں کو بھی کھانا دیا جاتا تھا اور انہیں انعام بھی دیا جاتا تھا۔ محرم کے دوران تعزیہ نکالا جاتا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح دیوالی میں ہم سب مل کر دیئے جلاتے اور ہولی میں ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے تھے۔ دسہرہ راجہ کے گاؤں سرائے پالی میں منایا جاتا۔ وہاں راجہ ایک جانور کی قربانی دیتا تھا اور رعایا انہیں (پیش کش) نذرانہ دیتی تھی۔ اسی موقع پر دس منہ والے راون کو مارتے بھی تھے اور کبھی کبھی میرے نزدیک رہنے والے کلار کے گھر میں رامائن کا پاٹھ ہوتا تھا اور میں بڑے مزے سے بغیر سمجھے سنا کرتا تھا۔ دوسرے موقع پر مقامی عورتیں سوآ گیت گاتیں اور ناچتیں اور

ہمارے گھر سے دسان وصول کر کے جاتی تھیں۔ اسی طرح برتن میں چھوٹے بوٹے اُگا کر کھیت یا تالاب میں لے جاتیں جنہیں ہم بھوجلی کہتے تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں ہمارے گھروں میں آتیں اور ہماری بہنوں سے ملتی تھیں۔ کبھی گورا تہوار ہوتا اور لوگ بالوں کو کھلا رکھ کر جھوم جھوم کر ناچتے تھے۔ ہولی تہوار میں ڈنڈے کو دوسرے ڈنڈے سے بجا کر گول گول گھوم کر ناچتے تھے۔ ان سب میں راون (Ravan) کی شکل بہت متاثر کرتی۔ ہو نہ ہو یہ بہت مضبوط اور طاقتور انسان رہا ہوگا۔ کیا میرے بھی دس سر ہو سکتے ہیں اور کیا میں بھی اتنا بڑا ہو سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ مسلمان رات میں کبھی کبھی میلاد شریف کے لیے جمع ہو جاتے۔ اس موقع پر نعت پڑھی جاتی۔ ہمارے چچا محمد سرور دانی اور امیر الدین صاحب بڑی سریلی آواز میں نعت سناتے۔ ان سب تہواروں کے موقعوں پر میرے والد صاحب نوکروں کو کچھ کپڑے اور کچھ روپیہ انعام میں دیتے تھے۔ یہ سارے گاؤں کے لیے خوشیوں کا دن ہوتا تھا اور ہم سب بچے اکٹھے خوش ہو کر کھیلتے تھے۔ یہ تہوار گاؤں کا تہوار تھا۔ انسانی جماعت کا تہوار تھا۔ ایک انسان کے ساتھ دوسرے انسان کے ملن کا تہوار تھا۔ سب طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوتی تھیں اور ہم سب اپنے دکھ درد کو ہولی کی آگ میں جلا کر ان شعلوں سے اپنی زندگی میں گرمی پہنچاتے اور دوبارہ کام کی طرف گامزن ہو جاتے تھے۔

پورے سات روز کے بعد ہفتہ کے دن کا بڑا انتظار رہتا کیونکہ اس دن بسنہ میں بازار لگتا تھا اور دور دور سے لوگ خرید و فروخت کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ مرد' عورت' بوڑھے بچے سبھی یہاں آتے' گائے' بیل' بکریوں کے ساتھ سبزی' چاول' دال' تمباکو' مٹھائیاں' نمکین' مرمرے' لڈو اور کھاجے ان کے علاوہ مٹی کے برتن' لوہے کے اوزار' تانبے کے برتن' ہر قسم کے کپڑے اور شہر سے لائی ہوئی روزمرہ کام کی چیزیں' کھلونے اور گھریلو سامان اور مقامی لوگوں کی بنائی ہوئی بانس کی ٹوکریاں اور سوپے (چھاج) وغیرہ بازار میں بکتے تھے۔ مجھے پہلے دو پیسہ اور بعد میں ایک آنہ والد صاحب سے بازار کے دن ملتا تھا۔ بازار میں بڑے بھائی صاحب سوت کی دکان لگا لیتے تھے۔ اسی طرح میرے چچا اور پھوپھا اپنی اپنی دکانیں لگاتے۔ ان کی دکانوں میں جا کر میں بیٹھتا تھا اور ان سے پیسے وصول کرتا۔ کسی ہفتہ کے دن پورے چار آنے

ہو جاتے۔ اب ہماری موج ہوتی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانے کی چیزیں خرید کر بڑے مزے سے سب کھاتے تھے۔

بازار دراصل ایک میلہ تھا جہاں رنگ رنگ کے لوگ گاؤں کے خوبصورت لباس میں آیا کرتے۔ بہت سی عورتیں اپنا دکھ درد رشتہ داروں سے سناتیں اور مل کر روتیں۔ کہیں دوسرے گاؤں کی لڑکیاں اپنی جوانی اور خوبصورتی کا مظاہرہ کرتیں۔ کسی طرف عورتیں فرش پر بیٹھ کر سبزیاں بیچتیں اور کہیں مرد کھاٹ پر سجا کر چیزیں فروخت کرتے۔ سارا دن بازار گرم رہتا۔ شام کے وقت لوگ واپس جانا شروع کرتے اور اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے میدان خالی ہو جاتا تھا۔ میدان میں ایک پرانا بڑ کا درخت تھا اور دوسرا پیپل کا۔ اسی کے سائے میں بیٹھ کر لوگ بازار کرتے تھے۔ یہ دونوں درخت بڑے مقدس تھے۔ انہیں کوئی نہیں کاٹتا تھا بلکہ لوگ ان کے پاس آ کر ناریل توڑتے تھے۔ اس سے کچھ دور ہی دو تین گول پتھر رکھے ہوئے تھے۔ اس پر ناریل کی بھینٹ چڑھاتے اور ان کے اوپر کے حصے سیندور سے مل دیتے تھے۔ یہ معمولی پتھر نہیں بلکہ دیوا اور دیوی سمجھے جاتے تھے۔ دونوں درخت گاؤں میں بہت مشہور تھے۔ شام کے وقت جب کبھی میں ادھر سے گزرتا، بڑا ڈرتا تھا۔ میں نے اپنی جوانی میں ان درختوں کو سوکھتے دیکھا اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ جس طرح گاؤں کے غیر مسلم لوگ ان کی پرستش کرتے تھے، اسی طرح گاؤں کے علم علاقہ میں ایک کھلی جگہ تھی جہاں سے محرم کی تعزیے نکلتے تھے۔ یہاں بھی ایک بڑا گول پتھر رکھا ہوا تھا جسے مقامی مسلمان تقدس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہاں اُس کے نیچے محرم میں آگ جلتی رہتی اور اُس کی راکھ کو ہم سب بدن پر ملتے تھے۔ کیا یہ آتش گاہ کا کوئی نمونہ تھا جو بھی ہو یہ ترکاری لوگوں کے لیے بہت اہم تھی۔

اسی طرح کے بازار دوسرے گاؤں میں بھی لگتے تھے۔ بدھ کے دن پھولجھر میں یہ بازار لگتا جو ہمارے گاؤں سے پانچ میل دور تھا۔ کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھ کر وہاں چلا جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی کو خوبصورت اور تیز رفتار بیلوں کا بڑا شوق تھا۔ وہاں بیلس کو دوڑاتے اور دوسری گاڑیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہماری گاڑی ایک درخت سے ٹکرائی کہ ہم سب اچھل کر باہر گر پڑے۔ میں بھی نیچے اُلٹ گیا اور میرا سر پہیے کے عین سامنے

آ لگا۔ گاڑی رُک گئی ورنہ گلا میرا پہیوں کے نیچے کچل جانا تھا۔

اس پھوبجھر گاؤں میں پرانے گونڈ راجاؤں کا ایک گڑھ (قلعہ) تھا جس کے گرد پتھر کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی تھیں۔ ان دیواروں پر میں کودتا، پھاندتا اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چھلانگیں مارتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ گڑھ کن لوگوں کی ہیں اور کب بنی ہیں۔ یہ کیوں ویران ہو گئے۔ وہاں مجھے کوئی نہ ملا۔ جو مجھے ان سوالوں کے جواب دے سکتا تھا۔ انوکھی اور عجیب دیواروں میں گم ہو جاتا اور یہ سوچتا کہ کاش یہ میرے اپنے گھر ہوتے، کم از کم مجھے ان کی کہانی تو معلوم ہوتی۔

بچپن ہی سے پرانی چیزوں میں میری دلچسپی اُجاگر ہونے لگی۔ اسی طرح بسنہ گاؤں کے ذرا باہر ایک بڑا سا پتھر کا تودا پڑا ہوا تھا۔ ظاہراً کالے رنگ کا تھا۔ ہم سب بچے ان کے اوپر چڑھتے اور پھسل کے نیچے آتے تھے۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ میں کبھی اس کے اوپر بیٹھ کر سوچتا تھا کہ یہاں نہ کوئی پہاڑی ہے اور نہ کوئی چھوٹے پتھر آخر یہ بڑا پتھر یہاں کیسے آیا۔ کیوں لوگ اس کی پوجا نہیں کرتے۔ وہ کیوں چھوٹے گول پتھروں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہو نہ ہو یہ کوئی منحوس پتھر کا تودا ہے لیکن مجھے اس سے بڑا پیار تھا کیونکہ وہ ہمارے کھیل کا ایک ذریعہ تھا۔ ہمارے لیے وہ ایک نعمت تھی۔ اس کے باوجود اس پتھر کی کہانی معمہ بن کر رہ گئی۔ اس کا مطلب بتانے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔

جب میں تھوڑا بڑا ہوا اور سائیکل چلانے لگا تو اکثر گاؤں سے تین میل دور چلا جاتا تھا جہاں ایک نالا تھا جس کا نام کمرٹھیل تھا۔ یہاں میرے والد صاحب نے سرکار کی طرف سے ایک پل تعمیر کیا تھا۔ یہ نالا چھوٹے چھوٹے پہاڑوں سے گزرتا تھا۔ پہاڑ کبھی میدانوں سے آ ملتے تھے۔ کہیں پتھر کی چٹان اور کہیں مٹی کے ٹیلے نظر آتے۔ انہیں چٹانوں سے پتھر کٹ کر نالے میں آ گرتے تھے اور یہاں پانی میں ٹکراتے ہوئے گول گول پتھر منہ روڑے (Pebble) کی شکل بنا لیتے تھے۔ پھر یہ نالے کے کنارے دور دور تک پھیل جاتے تھے۔ ان کو اُٹھانا اور اس سے کھیلنا چٹانوں پر لے جا کر توڑنا دونوں ایک جیسے لگتے اور مجھے بڑی خوشی ہوتی کہ میں نے دونوں کو ملا دیا ہے لیکن پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ چٹان یہاں کیسے آئی۔ ان پر یہ مٹی کے سطح کیوں جم گئی اور یہ چٹان اُونچے

نیچے کیوں ہیں۔ان کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔سوال بے شمار بڑھتے جاتے۔جستجو مجھے پریشان کرتی۔دوڑتا بھاگتا۔ڈھونڈتا' تلاش کرتا' کیا پاتا اور کیا نہیں پاتا۔یہ مجھے نہیں معلوم۔اندھیرے میں ایک انجان انسان کی طرح گم ہو جاتا۔انجانے کی تلاش تھی لیکن کوئی روشنی دکھانے والا نہیں تھا اور نہ میری پیاس کو بجھانے والا کوئی بچپن میں مجھے ملا۔یہ پہیلی بن کر رہ گئی۔شاید اسی راہ میں بھٹکتے بھٹکتے قسمت نے مجھے آثاریات کی طرف کھینچ لیا۔اس علم کے دیئے کو لے کر اب میں تحقیق کی راہ میں آگے چلتا جا رہا ہوں۔

باب دوم

تعلیم و تربیت

کشمیری خاندان چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو اپنی روایات اور رسم و رواج کو نہیں چھوڑتا۔ مدتوں سے غیر حکمرانوں کے تلے دبنے کی وجہ سے وہ اپنے آپ میں اور اپنی تاریخ میں ہی سکون حاصل کرتا رہا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کشمیری ہندو و مسلمان میں فرقہ وارانہ فساد نہیں دیکھا۔ گو کہ ہندو پنڈت تجارت میں بڑا ماہر ہوتا تھا اور مسلمان کا خون چوستا تھا لیکن پھر بھی ہندو فرقہ کے خلاف کشمیری مسلمان کی ضد کبھی نہیں رہی۔ مسلمان کشمیری تاجر بھی ایک دوسرے کو بڑا کاٹتے رہے۔ پھر بھی ان میں بھائی چارہ کا خیال ہمیشہ پایا گیا۔ یہ حالت ان کشمیریوں کی تھی جو ڈوگروں کی تلخی کی وجہ سے (پچھلی) صدی کے وسط میں اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ہندوستان کے دیگر شہروں میں آ کر آباد ہو گئے۔ ان شہروں میں اپنا محلہ علیحدہ قائم کیا اور ایک چھوٹا کشمیر جگہ جگہ بنالیا۔ شادی بیاہ آپس میں کرتے یا کشمیر جا کر کرتے مگر چونکہ ان کی لڑکیاں خوبصورت ہوتی تھیں ان پر اونچے گھرانوں کے جوان لڑکوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں اور وہ ان سے شادی کرنے کے خواہاں ہوتے تھے۔ کچھ لڑکیاں مجبوراً شادی کر بھی لیتی تھیں لیکن قدامت پسند کشمیری اس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ میرا کشمیری خاندان قدامت پسند تھا اور رسم و رواج اور شادی بیاہ کے معاملے میں ہم سب بڑے کٹر تھے۔ جیسے میں نے پہلے لکھا ہے ہماری کوشش یہی تھی کم از کم 1947ء تک ہم ان برہمن مسلم خاندانوں میں رشتہ قائم کرتے رہے جن کا تعلق کشمیر سے تھا۔ اسی کشمیری ماحول میں ہماری تربیت ہوتی اور اسی کی روایات بچپن سے اپنی

والدہ کے ذریعے کانوں تک پہنچتی رہی۔ اسی طرح عام آدمی ہمارے خاندان کے لوگوں کو ہند میں دانی کے نام سے پکارتا لیکن شادی بیاہ کے کاغذات میں ہم لوگ ہمیشہ وائیں لکھتے۔ یہ لقب اب جدی بن گیا اور صرف ہند کے وائیں خاندان خاص طور پر غلام رسول دانی کے بچوں تک محدود رہا۔ گو کہ ان کے بھائی عبدالرحمٰن کی اولاد اور تیسرے سوتیلے بھائی غلام قادر کی اولاد جو بسنہ آ گئے دانی لقب اپنے نام کے ساتھ لگانے لگے جو رشتہ دار امرتسر میں رہتے تھے۔ انہوں نے دانی لقب استعمال نہیں کیا۔ اسی طرح بٹ خاندان کے لوگ جو بسنہ آ کر آباد ہو گئے وہ بھی اپنے آپ کو دانی نہیں کہلاتے تھے۔ اس تفریق کی وجہ سے بسنہ میں دو کشمیری جماعتیں بن گئیں۔ ایک دانی خاندان کے لوگ جو بڑے بابو کہلاتے اور دوسرے بٹ خاندان کے لوگ جو چھوٹے بابو کہلاتے۔ شادی بیاہ کے ناتہ کی وجہ سے دونوں آپس میں مل گئے لیکن فرق آخیر تک قائم رہا اور چونکہ چھوٹے بابو کے خاندان میں امرتسر سے لوگ متواتر آخر تک آتے رہے۔ انہوں نے پنجابی زبان کو کافی حد تک قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم برصغیر کے بعد چھوٹے بابو کے بہت سے افراد پاکستان آ گئے اور دانی خاندان سے صرف میں اور میری وہ بہنیں جن کی شادی پاکستان میں ہوئی تھی یہاں آئے۔ اس کے علاوہ میرے سب سے چھوٹے چچا غلام محی الدین دانی جن کی شادی بسنہ میں چھوٹے بابو کے نووارد رشتہ دار مرزا صالح محمد کی لڑکی حمیدہ بیگم سے ہوئی تھی، بمعہ اپنے بچوں اور سسرال کے کراچی آ گئے۔ اس طرح دونوں کشمیری خاندان تقسیم ہو گئے اور ایک نئی دنیا میں اپنا مقام بنانے میں کوشاں رہے۔

میری زندگی پر امرتسر کے شہری ماحول کا اور بسنہ کی دیہاتی زندگی کے دونوں اثرات پڑے۔ ان دونوں کے اوپر کشمیری روایت پسندی کا خول چڑھا رہا اور میری شخصیت عجیب سی بن کر ابھری۔

امرتسر پنجاب کا ایک شہر تھا جسے سکھوں نے شروع میں آباد کیا تھا اور یہ شہر گولڈن ٹیمپل (دربار صاحب) کے اردگرد پھیلتا گیا لیکن بعد میں یہ تجارتی مرکز بن گیا۔ ہندو اور مسلمان تجارتی دونوں نے یہاں آ کر اپنے اپنے محلے بنائے۔ ہندو تاجروں کو ہم زیادہ تر کھتری کہتے تھے اور مسلمان تاجروں میں کشمیری اور شیخ پیش پیش تھے۔ کشمیریوں کا ماحول الگ تھلگ تھا اور چونکہ یہ

سب مسلمان تھے ان میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ اپنا ہوتا تھا۔ قدامت پسند ہونے کی وجہ سے مسجدوں سے ان کا گہرا تعلق تھا اور تجارت پیشہ کی بنا پر مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ بہت سے مدرسے انہوں نے خود نجی طور پر کھولے تھے۔ کشتیوں کے ان کے پاس اکھاڑے تھے۔ دودھ ملائی اور ربڑی کی اپنی دکانیں ہوتی تھیں چونکہ یہ قلچے' باقر خانی' نان خطائی' کڑا (یعنی حلوا) کے شوقین تھے۔ ان کی دکانوں میں یہ کھانے کی چیزیں بکتی تھیں۔ کشمیری کھانے پینے کا بڑا شائق ہوتا ہے اور کشمیری کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے دوسرے بھی بہت پسند کرتے تھے۔ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا۔ کھانے سے پہلے طشت (یعنی چلمچی) اور آفتابہ سے ہاتھ دھونا۔ بسم اللہ پڑھنا اور بعد میں شکرانہ کی دعا کرنا معمول ہو گیا تھا۔ گھر اور محلے میں بڑوں کی عزت کرنا۔ ماں باپ کا کہنا ماننا۔ ماں اور ماں کے رشتہ داروں سے ادب سے باتیں کرنا۔ بہنوں کا خاص خیال رکھنا عادت سی بن جاتی تھی۔ مذہبی تعلیم لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے ضروری تھی۔ جب چھوٹے ہوتے تو مسجد میں جا کر قرآن شریف پڑھنا لازمی تھا۔ امرتسر کا ایک کشمیری بچہ اس طرح ظہر کی روایتی زندگی میں رچ بس کر نکلتا تھا اور اس میں اسلام کی روایتوں کا اثر لبالب بھرا ہوتا تھا۔ ان بچوں میں سے میں بھی ایک تھا اور اس طرح امرتسر شہر کے کشمیری ماحول کا اثر میری زندگی میں سرائیت کر گیا تھا۔

اس کے برعکس بسنہ کی دیہاتی فضا بالکل مختلف تھی۔ وہاں ہمارا خاندان ایک قسم کا حکمران کی حیثیت رکھتا تھا۔ آگے پیچھے نوکر چاکر ہوتے تھے۔ تجارت صرف معاشی مدد کے لیے کی جاتی تھی۔ اصل پیشہ زمینداری تھا اور زمین کی کاشت کا کام مقامی نوکروں سے کرایا جاتا تھا۔ یہ نوکر ہمارے غلام ہوتے تھے لیکن انسانی ہمدردی کے تحت ان کا سارا خرچ ہمارے خاندان کے لوگ ہی برداشت کرتے تھے۔ ان مقامی لوگوں میں (ترکاری) ترکی النسل کے مسلمان ہم سے قریب تر ہوتے۔ ان کے بچے بچیاں ہمارے گھروں میں کام کرتیں اور ہم لوگوں کا ان کے ساتھ برتاؤ مختلف ہوتا۔ اس کے علاوہ گونڈ اور اُڑیا لوگوں سے ہم قدرے دور رہتے لیکن یہ بھی چمار اور گھیے کے مقابلے میں نزدیک تر ہوتے۔ ان سے اُونچے درجہ کے لوگ کلار' تیلی' دھوبی' نائی وغیرہ ہوتے جو ہمارے ملازم نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے نجی کام کی بنا پر اونچے طبقے میں شامل ہوتے۔ نوکروں سے کام لیا جاتا اور ان سے گہرا تعلق بھی قائم کیا جاتا۔ خاص طور پر بچے ان سے بڑی محبت

کرتے کیونکہ ان کے پاس ہی وہ پلتے اور انہی کے بچوں کے ساتھ وہ کھیلتے۔اس طرح ان کی زبان بھی وہ سیکھ جاتے۔ پھر بھی کشمیری بچہ ان سے جدا ہوتا اور اپنی شخصیت بنانے میں ان کے اثرات کے باوجود اپنے آپ میں برتری کا احساس پیدا کرتا۔ دیہاتی زندگی سے انہیں واقفیت تو ہو جاتی لیکن اس پر حائل کبھی نہ ہوتے۔ مقامی عادات کو پرکھتے' پہچانتے اور کبھی کبھی عمل بھی کرتے لیکن شہری زندگی کی طرف رغبت ان کے اپنے خاندان والے ان میں بھر دیتے۔اس طرح بسنہ میں رہنے کے باوجود میری زندگی پر شہری زندگی کے اثرات زیادہ نمایاں ہوئے۔ وہاں کے مقامی لوگوں سے پیار اور محبت کے باوجود میرا جھکاؤ کشمیر کی روائیت کی طرف زیادہ رہا اور میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کشمیری ہی محسوس کیا۔ یہ عجیب سا معمہ تھا۔ کشمیر سے ہزاروں میل دور بسنہ گاؤں کے ماحول میں شرابور' وہاں کے بچوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا' وہاں کے بازاروں میں' گلیوں میں دھول اور گندگی میں محو ہو جانا لیکن پھر بھی تالاب کے کنول کے پھول کی طرح اپنے آپ کو الگ سمجھنا ہماری اپنی ایک علامت (Symbol) بن گئی۔ یہ تھی میرے بچپن کی تربیت جس نے مجھے بہت سارے تجربے دیئے اور انسانیت کا سبق سکھایا۔ مسلمان ہونے کے باوجود بڑے بابو کے گھر کا بچہ ہونے سے بھی ایک انسان کا دوسرے انسان سے نفرت کرنا میں نے نہیں سیکھا اور نہ ہی فرقہ وارانہ تعصب نے مجھ پر قابو پایا۔ مسلم' ہندو' سکھ میرے لیے سارے برابر تھے کیونکہ میں ان سب بچوں سے گھلتا ملتا تھا۔اونچے گھرانے اور نوکروں کے بچوں میں تمیز بہت کم کرتا تھا۔ میرے لیے سب بچے ایک جیسے ہی ہوتے کیونکہ ان سب کے ساتھ کھیل میں مجھے مزا آتا۔ سبھی میں گھل مل جاتا اور اپنے آپ میں کھو جاتا۔ ایسا لگتا کہ میں زندگی کے ایک مسلسل بہاؤ میں ڈوبا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں اور ہم سب ایک دوسرے کے سہارے ایک دوسرے کو سنبھالے راستہ طے کرنے کی کوشش میں ہیں۔ یہاں میرا امرتسر کا ماحول اور بسنہ کی فضا اکٹھی ہو جاتی اور مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں شہری کہاں ہوں اور دیہاتی کہاں شاید دونوں ایک ہی دھارے میں سما جاتے اور ہم دنیا کی رَو میں بہتے چلے جاتے۔

تعلیم میں نے ماں کی گود میں اور کشمیری خاندان کے گھروں میں شروع کی۔ ریل' بیل گاڑی اور تانگے کے سفر نے بھی میری باہر کی دنیا کو میری نظروں کے سامنے پیش کیا۔ ریل میں سفر

کرتے وقت میں گھنٹوں تیڑا اور وندھیا کے جنگلوں کو دیکھتا اور چھتیس گڑھ کے ڈراؤنے جنگل سے مقابلہ کرتا جو بندروں اور جنگلی جانوروں سے بھرے ہوتے۔ امرتسر کے باغات اور نہریں اور اونچے اونچے مکانوں کی کشش اپنی جگہ تھی۔ اس سے بڑھ کر یہاں مسجد میں جانا اور قرآن کے حروف کو پہچاننا اور ان کے الفاظ کو اونچی آواز میں پڑھنا معمول سا بن گیا تھا۔ کبھی غلط پڑھنے پر انگلیوں پر سوٹی سے مار کھانا اور پھر سنبھل جانا اور بڑے ادب سے آیات کو رٹا لگانا یا اسے دوہرانا اُس وقت کے پڑھنے کا طریقہ تھا۔ اس سے یادداشت بڑھتی گئی۔ ایک یا دو مرتبہ پڑھنے کے بعد آیات کی آیات کا منہ زبانی دماغ پر بیٹھ جانا بڑا آسان ہو گیا۔ اگر میں امرتسر میں متواتر رہتا تو شاید قرآن کا حافظ بن جاتا لیکن یہ موقع ہاتھ نہ آیا کیونکہ والدین مجھے بار بار بسنہ لے جاتے اس طرح یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ پھر بھی میں قرآن شریف کو پڑھنے کا کام جاری رکھتا اور آٹھ سال کی عمر سے پہلے میں نے پورا قرآن شریف ختم کر لیا۔ نماز پڑھنے کا طریقہ سیکھ گیا۔ تمام کلمے یاد کر لیے اور گرمیوں میں بھی دو ایک روزے رکھنا شروع کر دیئے۔ اس اسلامی رنگ کی تعلیم کی چھاپ امرتسر میں لگی اور اس کی تکمیل بسنہ میں بھی ہوئی۔ جہاں چھوٹی مسجد میں ایک آفریدی مولوی جس کا نام تحکول تھا مجھے عربی تعلیم دیتا۔ اس مولوی کے انتقال کے بعد دو اور افغان مولوی بسنہ آئے اور انہوں نے مجھے با قاعدہ نماز پڑھنے پر لگا دیا۔ میری والدہ مجھے اس طرف مائل کرتیں اور صبح صبح اُٹھا دیتیں۔ خود قرآن شریف لے کر پڑھنے بیٹھ جاتیں اور مجھے مسجد جا کر نماز پڑھنے کو کہتیں۔ کبھی میں اپنے والد صاحب کے ساتھ جاتا اور بعد میں خود نماز کا پابند ہو گیا۔ اس کام میں میرے دادا کے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن دانی اور ان کے بڑے لڑکے عبدالحمید دانی جو میرے پھوپھا تھے بڑی ترغیب دیتے تھے۔ چھوٹی عمر میں ہی لوگ کہتے کہ مولوی بن گیا ہوں۔ یہاں تک کہ گانے ناچنے سے پرہیز کرنے لگا۔ جب میرے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تو میں گانے بجانے کی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میں رات کو نماز پڑھ کر بسنہ کے گاؤں میں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ معمول کی طرح سویا ہوا تھا کہ اچانک میں نے خواب دیکھا، روشنی چھا گئی۔ میں نے ایک محفل میں اپنے آپ کو بیٹھا پایا۔ سرنگوں اور دست بدستہ ایسا معلوم ہوا کہ میں نورانی نور کے سامنے

مخاطب ہوں اور شاید کوئی میرے حق میں پیروی کر رہا ہے۔ مجھے بہت تسکین ہوئی اور اطمینان ہوا کہ میں سیدھے راستے پر ہوں لیکن روشنی نے مجھے چکا چوند کر دیا۔ میں ڈر گیا اور ڈر سے چیخ ماری اور پھر اٹھ کھڑا ہوا کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا ہوں لیکن اس خواب نے میری زندگی پر روحانی طاقت کے اثر مضبوط کر دیئے۔

اس دینی تعلیم کے ساتھ میں نے سکول جانا شروع کر دیا۔ جب امرتسر میں ہوتا تھا تو پڑھتا اور بسنہ میں ہوتا تو وہاں کے ہندی پرائمری سکول میں داخل ہو جاتا۔ اس طرح دونوں زبانیں سیکھتا لیکن کسی میں بھی تسلسل قائم نہیں رہتا۔ والد صاحب صرف اتنا خیال رکھتے تھے کہ میں ان کے بہی کھاتے کا کام سیکھ جاؤں اور ان کی مدد کروں۔ اس سے پہلے کہ میں لگاتار شہر میں جا کر پڑھتا انہوں نے میرے دوسرے بڑے بھائی غلام حیدر کو رائے پور بھیج کر ایک ہندو دوست کے گھر رکھوا دیا۔ جہاں وہ مڈل سکول میں انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بدقسمتی سے ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک دفعہ جب وہ بسنہ چھٹیوں میں آئے تو ہیضہ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس سے میرے والدین کو بڑا دھچکا لگا اور مجھے انہوں نے رائے پور پڑھنے کے لیے نہیں بھیجا۔ میرے بڑے بھائی غلام مرتضیٰ دانی کو اپنے ساتھ تجارت میں لگا لیا تھا۔ میرے ساتھ اتنی رعائیت برتی کہ مقامی سکول میں جانا شروع کر دیا جہاں ہندی حساب وغیرہ پڑھتا وہاں ایک برہمن پنڈت داسرتھی ہیڈ ماسٹر تھے جو اپنے روائتی علم میں بڑے ماہر تھے۔ وہ ہم بچوں کو رامائن اور مہابھارت کی کہانی سناتے اور جو کچھ تاریخ سے ان کو واقفیت تھی ہمیں منہ زبانی سنایا کرتے تھے۔ اس کا بڑا اثر ہم پر ہوا کرتا تھا اور یہ کہانیاں میرے دماغ میں رچ بس جاتیں۔ میں انہیں دوہراتا اور ہوتا جی بہت خوش ہوتے اور میرے والد صاحب کو مجھے آگے پڑھانے کے لیے راغب کرتے لیکن والد صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ میں نے بسنہ میں دوبارہ پرائمری سکول ہندی میں پاس کیا۔ پہلے اردو میں امرتسر میں کر چکا تھا۔ اس کے بعد جب مڈل سکول نیا نیا کھلا تو اس میں داخل ہو گیا۔ حساب، تاریخ اور ہندی لکھنے میں بڑی مہارت حاصل کی اور اپنی کلاس کے ساتھیوں پر سبقت لے جاتا۔ میرے سارے استاد خوش تھے لیکن کافی عمر تک میں نے انگریزی بالکل نہیں پڑھی۔ ہندی تعلیم نے علم کا ایک نیا خزانہ میرے سامنے کھول دیا۔ اسلامی مذہب

میں رنگنے کے باوجود ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو پڑھنے کا بڑا شوق ہوا۔ میں اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب ہی کا مرہونِ منت ہوں کہ انہوں نے مجھے اس راستے پر لگایا میں نے دونوں مذاہب اور ان کی تہذیبوں سے فائدہ اُٹھایا اور مسلمان ہونے کے باوجود میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ہندو مذہب کی تعلیم شاید کفر کی طرف نہ لے جائے۔ اسلام کی محبت مجھ میں برقرار رہی۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو علم کے تجسس نے مجھے اس طرف چلنے پر مجبور کیا۔

ہمارے بسنہ گاؤں سے پانچ میل دور جگدیش پور نام کا ایک دوسرا گاؤں آباد تھا جہاں امریکیوں نے ایک عیسائی مشن سکول اور ہسپتال کھول رکھا تھا۔ وہاں سے ایک روز نندرام نام کا ایک عیسائی شخص آیا۔ وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔ میرے والد صاحب کو کہا کہ وہ بچوں کو انگریزی تعلیم دے گا۔ میرے والد صاحب بہت خوش ہوئے۔ بسنہ میں ہی اسے رہنے کی جگہ دے دی۔ اسے نوکری بھی دی اور ہم سب بڑے بھائی' والد صاحب اور میں ہم تینوں انگریزی پڑھنے لگے۔ والد صاحب نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی۔ بڑے بھائی نے کافی مہارت حاصل کی اور میں نے بھی دھیرے دھیرے انگریزی الفاظ اور اس کے قواعد اور پھر انگریزی بولنا تھوڑا تھوڑا شروع کیا لیکن میری انگریزی ہندی نما تھی۔ کیونکہ استاد بھی ہندی نما تھے۔ ہندی میں سوچتے اور پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں کرتے۔ اس طرح جب میں نے بسنہ میں مڈل سکول پاس کیا میری عمر بارہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ گھر میں انگریزی پڑھتے دو سال ہو گئے تھے۔ اب آگے پڑھنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہیں سے شاید تجارت میں گھس جانے کا موقع تھا۔

اسی دوران میرے پھوپھا جان عبدالحمید دانی صاحب کے بڑے لڑکے عبدالحفیظ نے پرائمری پاس کیا تھا۔ پھوپھا صاحب نئے نئے امرتسر سے آئے تھے۔ ان کے والد صاحب نے امرتسر کا جلیان والا باغ کا ولولہ خیز جلسہ دیکھا تھا۔ عبدالحمید دانی صاحب اس سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ ان میں سیاست کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے بسنہ میں انہوں نے اردو مدرسہ کھولنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک مجلس قائم کی اور اس کے سیکرٹری بن گئے اور ساری عمر سیکرٹری صاحب کہلائے۔ اس کے بعد سیاست میں بھی آئے اور کانگرس پارٹی میں شامل ہوئے۔ بہر حال اس وقت انہیں اپنے بڑے لڑکے کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ اسی سلسلے میں وہ میرے والد کے پاس آئے

اور انہیں مجبور کیا کہ ان کا بڑا لڑکا اور میں دونوں شہر جا کر انگریزی سکول میں داخل ہوں لہٰذا ہمیں نزدیک ترین تحصیل مہاسمند کے انگریزی مشن سکول میں داخلہ کے لیے بھیجا گیا۔

میرے پھوپھا خود ہم دونوں کو لے گئے۔ چونکہ ہمارے پاس انگریزی کا باقاعدہ سرٹیفکیٹ نہیں تھا اس لیے امتحان میں بیٹھنا پڑا۔ اس امتحان کے نتیجہ میں مجھے ساتویں جماعت میں اور میرے پھوپھا کے لڑکے عبدالحفیظ کو پانچویں کلاس میں داخلہ دیا گیا۔ سکول کے ہاسٹل میں ہی ہمیں رہنے کے لیے جگہ مل گئی۔ اس طرح شہر میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔

اس وقت رائے پور ضلع میں مہاسمند ایک بہت بڑی تحصیل تھی۔ اس کے اندر ہی بسنہ اور کانکیر کی گونڈ ریاستیں تھیں۔ یہ شہر مہاندی دریا کے پورب میں قریب بیس میل واقع تھا۔ یہاں سب مقامی لوگ چھتیس گڑھی بولتے تھے۔ پڑھے لکھے لوگ ہندی اور انگریزی بولتے تھے۔ دو زبانوں میں بولنے کی مجھے بھی عادت سی پڑتی گئی اور پنجابی قریب قریب کم ہوتی گئی۔ ہاسٹل بہت چھوٹا سا تھا اور مسلمان ہیڈ ماسٹر صاحب خود ہی اس کے وارڈن تھے۔ یہاں بہت تھوڑے لڑکے رہتے تھے جو دو دو یا چار چار مل کر ایک کمرے میں قیام کرتے۔ صرف دو وقت کھانا ملتا چونکہ کلاس ہماری دس بجے شروع ہوتی تھی۔ اس لیے پہلا کھانا اس سے پیشتر اور دوسرا شام کو۔ اکثر کھانے میں سبزی، دال اور چاول ہی ہوتے تھے۔ کبھی کبھار گوشت کھانے کو مل جاتا تھا۔ باقی وقت میں اگر دودھ پینا ہو یا چھولے کھانے ہوں تو علیحدہ پیسے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ ہاسٹل میں صرف پاخانہ کا انتظام تھا لیکن منہ دھونے اور نہانے کے لیے ہمیں نزدیک کے ہی ایک چھوٹے نالے میں روز صبح مل کر جانا پڑتا اور وہاں سے واپس آتے۔ میری چونکہ ہندی لکھائی اور حساب دونوں بہتر تھے اس لیے بہت سے لڑکے مجھ سے ہی اپنا ہوم ورک کراتے۔

یہ سکول بھی امریکن مشن کا تھا۔ کبھی کبھار ہم بچوں کو اتوار کے روز گرجا گھر لے جاتے اور وہاں بائبل سے سبق سناتے۔ اس سکول میں کچھ عیسائی لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ میں چونکہ نماز اور روزہ بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا اس لیے عیسائی لڑکوں سے مذہب پر کبھی کبھی بحث بھی ہوتی لیکن بحث صرف سمجھنے کی حد تک رہتی اور ہم ایک دوسرے سے سیکھنے کی بڑی کوشش کرتے۔ بسنہ کے مڈل سکول میں جہاں میں ہندی میں پڑھ کر آیا تھا اس کا معیار کافی اونچا تھا۔ یہاں فرق صرف

اتنا تھا کہ انگریزی پر زیادہ زور تھا جسے یاد کرنے میں مجھے کوئی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ اپنی یادداشت کی وجہ سے میرے استاد مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب مڈل سکول کے سکالر شپ امتحان میں بیٹھنا پڑا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بھی اس کے لیے بھیجا۔ ایک دن حساب کا پرچہ تھا جو کہ تین گھنٹے میں کرنا تھا۔ میں نے اسے ایک گھنٹے سے پہلے ہی ختم کرلیا اور اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سپرنٹنڈنٹ کو دینا چاہا۔ وہ بہت ناراض ہوا اور ڈانٹ کر کہنے لگا کہ میں نکما ہوں اور ایک گھنٹہ کے اندر ہی بھاگنا چاہتا ہوں۔ قانون کے مطابق مجھے کم از کم دو گھنٹے وہاں بیٹھنا تھا۔ میں رونے لگ گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے میرا پرچہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ غور سے دیکھا اور کہا کہ تم نے تو سب ٹھیک کرلیا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اس طرح میری جان چھوٹی۔ بعد میں مجھے سکالرشپ بھی مل گیا جو اس زمانے میں چار روپے ماہوار ہوتا تھا اور جب تک میں نے ہائی سکول پاس نہیں کرلیا یہ رقم ملتی رہی۔

چونکہ کھانا ہمیں بڑی کفایت سے ملتا تھا۔ میری ماں خرمی بنا کر مجھے دے دیتیں جسے میں مہینہ بھر تھوڑا تھوڑا کھاتا اور جب کبھی چھٹیوں میں گھر جاتا تو والدہ صاحبہ سے کچھ رقم چھپ کر لے لیتا کیونکہ والد صاحب ہمیشہ کم رقم دیتے تھے۔ اس زمانے میں میرے چچا محمد سکندر دانی نے بسنہ میں اپنی ایک دکان علیحدہ کھول رکھی تھی۔ وہ سامان خریدنے کے لیے رائے پور شہر جاتے۔ انہیں مجھ سے بڑا پیار تھا۔ وہ اکثر مجھے ملنے ہاسٹل آتے اور کچھ پیسے میرے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اگر وہ خود نہیں آسکتے تو نوکر کے ہاتھ سائیکل پر بھیج کر میرے لیے کھانے کی چیزیں بھجوا دیتے۔ ایک دفعہ شام کے وقت نوکر آیا اور سائیکل برآمدے میں رکھ کر میرے کمرے میں آیا۔ میں خوشی کے مارے کمرے سے باہر آیا اور اس کی سائیکل سے کھیلنے لگا۔ رات ہو چکی تھی۔ برآمدے پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں گھنٹی بجاتا رہا اور ساتھ ہی اپنے پاؤں سے کوئی زمین پر پڑی ہوئی کسی ملائم سی چیز کو مزے سے چھو رہا تھا۔ اتنے میں میرا ایک ساتھی جو ٹارچ لے کر اُدھر آیا تو میری سائیکل کو دیکھا۔ اچانک اس کی نگاہ میرے پاؤں پر پڑی تو اس نے مجھے زور سے بھاگنے کو کہا اور میں نے بھاگتے ہوئے دیکھا کہ میرا پاؤں ایک سانپ کے اوپر تھا اور وہ مزے سے لیٹا ہوا تھا۔ یہ ناگ سانپ تھا جسے بعد میں مار دیا گیا اور میں اس سے بال بال بچ گیا۔

مہاسمند میں صرف مڈل سکول تھا۔ یہاں سے پاس کرنے کے بعد رائے پور شہر کے سینٹ پال سکول میں نویں کلاس میں داخل ہوا۔ یہ بھی امریکن مشن سکول تھا۔ اس کا پرنسپل ایک امریکن تھا اور ہیڈ ماسٹر مرہٹہ تھا۔ اسی کے ہوسٹل میں مجھے رہائش کے لیے جگہ مل گئی۔ اس کا وارڈن ولیم ماسٹر تھا جو وہیں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ وارڈن بہت سخت آدمی تھا۔ ہاسٹل کے قانون کے مطابق ہر اتوار کو ہمیں گرجا گھر جانا پڑتا تھا اور ہر بدھوار کو بائبل کا سبق دیا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ میں پرانا ٹسٹمنٹ بھی پڑھتا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ ہمارے انبیاء کی کہانی اور اس کتاب کی کہانیوں میں بہت سی باتیں مشترک ہوتیں۔ میرا شوق اور بڑھتا گیا۔ اس طرح اسلام اور عیسائی مذاہب کو مقابلتاً پڑھنے کا بڑا مزا آتا۔ مجھے دونوں مذاہب کی روایتوں پر عبور حاصل ہوگیا۔ مجھے دونوں مذاہب ایک جیسے لگے۔ اس میں جو فرق لوگ بتاتے تھے میں نے کبھی ان پر زور نہیں دیا۔ ایک طرف میں نزدیک کی مسجد میں ہر جمعہ نماز پڑھتا اور باقی نمازیں گھر پر ہی ادا کرتا جبکہ دوسری طرف گرجا گھر باقاعدگی سے جاتا اور وہاں دعا میں شریک ہوتا۔

اس وقت رائے پور ہائی سکول میں امتحان کے لیے تین سال پڑھنا پڑتا تھا۔ نویں' دسویں اور گیارہویں۔ میرے سکول میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ اس میں مجھے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی اس کے علاوہ نویں جماعت میں ایک کلاسیکل مضمون ضروری تھا۔ چاہے میں سنسکرت پڑھوں یا فارسی یا عربی۔ میں نے ایک نئی زبان سنسکرت پڑھنے کو ترجیح دی۔ اس سکول میں اکیلا مسلمان طالب علم میں تھا جس نے اس مضمون کو پڑھنے پر آمادگی ظاہر کی۔ استاد بنارس کے پنڈت رام ہی تھے۔ میں نے دل لگا کر پڑھنا شروع کیا۔ سنسکرت کے قواعد پر زور تھا۔ مصدر کے حرکات کو رٹا لگانا تھا۔ یہ میرے لیے مشکل نہ تھا۔ اس کی شروعات سب سے پہلے رام کے لفظ سے ہوئی۔ میں نے اسے پوری طرح سے یاد کرلیا۔ اس وقت سکول میں یہ طریقہ تھا کہ استاد جو سبق دیتے تھے اُسے پوچھا کرتے تھے۔ مجھ سے رام کی حرکات بار بار پوچھیں لیکن یاد کرنے کے باوجود جماعت میں جب میں کھڑا ہوتا اور اپنے استاد سے مخاطب ہوتا تو میرے دماغ سے یہ بالکل نکل جاتیں۔ استاد مجھ سے بڑے ناراض ہوتے اور مجھے جماعت سے نکل جانے کو کہتے اور پھر یہ الزام لگاتے کہ مسلمان کبھی سنسکرت نہیں سیکھ سکتا۔ مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آتا کہ میں نے بڑی محنت کی اور

پورا یاد کیا لیکن استاد کا چہرہ دیکھ کر بالکل کورے کا کورا رہ جاتا۔ میں بڑا پریشان ہوا اور قصد کیا کہ سنسکرت ضرور پڑھوں گا۔ میرا ایک جماعتی برہمن پجاری کا لڑکا تھا۔ میں نے اسے پڑھانے کے لیے کہا۔ وہ مجھے ایک درخت کے نیچے لے جاتا۔ لنگوٹ کس کر طوطے کی طرح ہر لفظ کے قواعد رٹا دیتا۔ اس طرح کورس کی ساری کتاب منہ زبانی یاد کر لی۔ جب چھ ماہ کے بعد کلاس کے اندر گھسے تو وہ لڑکا میرے سامنے بیٹھا اور مجھ سے کہا کہ جب استاد سوال کرے تو میں اس کی طرف دیکھوں اور استاد کو بالکل نہ دیکھوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور تمام الفاظ کی ساری حرکات صحیح صحیح دہراتا گیا۔ استاد صاحب بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے کہا کہ پہلے بھی مجھے یہ سب یاد ہوتے تھے لیکن کسی طرح استاد کا چہرہ مجھے سب کچھ بھلا دیتا۔ شاید یہ نفسیاتی اثر ہو۔ اس کے بعد جب نویں جماعت کا آخری امتحان ہوا تو مجھے 50 نمبروں میں سے 49 اور میرے ہم جماعتی پجاری کے لڑکے کو 45 نمبر ملے۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ جو کچھ سنسکرت میں جانتا ہوں سب اس کی وجہ سے ہے۔ صرف یادداشت کی وجہ سے میں اس پر سبقت لے گیا اور اپنی جماعت میں اوّل آیا۔ برہمن استاد بہت خوش ہوا۔ امریکن پرنسپل بھی بہت خوش ہوئے اور آگے سنسکرت پڑھنے کی ترغیب دی۔ میرا اس سے آگے سنسکرت پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن مجبوراً پڑھنا پڑا۔

اسی طرح میں بچپن ہی سے حساب میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ میرے استاد مجھے اکثر نویں سے دسویں اور گیارہویں جماعتوں میں لے جاتے اور بڑے لڑکوں کے ساتھ مجھے بیٹھنے کو کہتے۔ ہر سوال کا جواب میں منہ زبانی جلدی سے دیتا اور اس طرح لڑکوں اور استادوں میں مجھے بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی۔

ہمارے ہاسٹل میں قانون بڑے سخت تھے۔ وقت پر اٹھنا، اپنا بستر ٹھیک کرنا، صاف ستھری پوشاک پہننا، وقت پر پڑھنا اور کھیلنا اور ٹھیک وقت پر سونا پڑتا تھا۔ اس ماسٹر ولیم کی سختی سے ہم پر روزمرہ کی زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوگئی۔ میں صبح اٹھتا، نہا دھو کر نماز ادا کرتا اور صبح کی سیر کے لیے نکل جاتا چونکہ ولیم ماسٹر بھی سیر کے لیے نکلتے، اکثر راستے میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی اور وہ مجھ سے بہت خوش ہوتے۔ چونکہ مجھے کھیلنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا اس لیے میں شام کو بھی سیر کے لیے نکل جاتا اور درخت کے نیچے بیٹھ کر کبھی کبھی کاغذ پر نہ جانے کیا کیا لکھ مارتا تھا اس طرح

بہت سارے کاغذ لکھ کر انہیں میں جمع کرتا اور پھر پھینک دیتا۔ اس عمل سے مجھ میں سوچنے اور لکھنے کی کافی عادت پیدا ہوگئی۔ میں اکثر گھنٹوں درخت کے نیچے بیٹھ کر مذہب، تاریخ، انسان اور دنیا کی حرکات کے متعلق سوچتا اور ان پر لکھتا لیکن کھانے کے بعد رات میں مجھ سے پڑھا نہیں جاتا تھا۔ ہاسٹل میں ایک بڑے کمرے میں بند ہم سب کو اکٹھے دس بجے تک لازماً پڑھنا پڑتا تھا۔ ایک مانیٹر سامنے بیٹھتا جو ہماری نگرانی کرتا۔ میں سب سے آخر والی قطار میں بیٹھتا۔ اپنے سامنے کتاب کھول کر رکھ دیتا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں چھپا لیتا اور سو جاتا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں ایسے ہی سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ اتنے میں ولیم ماسٹر ایک طرف سے آئے اور مجھے سوتے پا کر غصہ میں آپے سے باہر ہوگئے۔ اپنے بیت کی نوک سے میرے بدن کو چھوا۔ میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ انہوں نے میری پیٹھ پر زور سے ضرب لگائی، میں چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میری سزا یہ ہوئی کہ میں پورا ہفتہ بینچ پر کھڑا ہو کر پڑھوں گا۔ کھڑے ہونے کی سزا ہی کافی تھی لیکن بعد میں بھی سونے سے باز نہیں آیا کیونکہ بچپن میں ہی والد صاحب نے جلدی سونے کی عادت ڈال دی تھی۔ یہ عادت ایسی پڑی کہ ہمیشہ میں رات میں بہت کم پڑھنے کا عادی ہوا۔

اسی زمانے میں مجھے اخبار پڑھنے کا شوق ہوا۔ ہمیں وہاں انگریزی اخبار امرت بازار پتر کا ملتا تھا۔ کبھی کبھی ہندی اخبار میں مل جاتے۔ میں نے روزانہ پتر کا پڑھنا شروع کر دیا اور جب تک میں ہائی سکول میں رہا 1935ء سے لے کر 1938ء تک پتر کا میں لکھے گئے سیاسی مقالوں کا غور سے مطالعہ کرتا تھا۔ ان سے مجھے تاریخ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا جو کچھ مجھے انگلینڈ اور ہندوستان کی تاریخ کی کتابیں ملیں سب پڑھتا جاتا تھا۔ بازار میں ایک دکاندار تھا جو ایسی کتابیں بیچتا تھا۔ میں ان سب کو خرید کر لاتا اور بغور مطالعہ کرتا شاید ہی کوئی ایسا سیاسی لیڈر تھا جس کے متعلق مجھے علم نہیں ہوتا۔ مولانا محمد علی، مولانا آزاد، گاندھی، جواہر لال نہرو، تلک اور گوکھلے اور پھر محمد علی جناح سب کے متعلق پڑھتا لیکن مسلم لیگ پر کتابیں زیادہ نہیں ملتی تھیں۔ مسلمان ہونے کے باعث اس سے مجھے بھی دلچسپی تھی لیکن یہ ساری باتیں علمی حد تک محدود تھیں۔ کبھی سیاست میں حصہ لینے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ ایک دفعہ میرے ایک ہم جماعتی مکرجی نے بڑی کوشش کی کہ میں اس کے ساتھ مل کر سکول میں ہڑتال کراؤں لیکن میں اس سے دور رہا اور سوچتا رہا کہ آخر لوگ سیاست میں

کیوں آتے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا سمجھ میں آتی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہندو اور مسلمان آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔ بسنہ گاؤں میں تو ہم لوگ اکٹھے رہتے تھے۔ یہاں سکول میں سارے مذاہب کا مطالعہ کرنے میں مجھے بڑا مزا آتا تھا۔ زبانیں بھی میں بہت ساری بولتا اور پڑھتا رہا اور جب سے میں نے سنسکرت پڑھنا شروع کی اس زبان کی کتابوں میں بڑی دلچسپی لینے لگا۔ ہندو مذہبی کتابوں سے لگاؤ ہو گیا۔ ہندی زبان کی ہر کتاب کو بڑے شوق سے پڑھتا۔ ناولوں' تاریخ کو اور مسئلہ مسائل کی ہر قسم کی کتاب پڑھنے کا شوق ہوا۔ چھٹیوں میں کتابوں کا ڈھیر لے کر بسنہ جاتا اور دن بھر اکیلے پڑھتا رہتا۔

میری عمر بھی اب سولہ سترہ برس سے زیادہ ہونے لگی تھی۔ عمر کے ساتھ جوانی کا خون بھی کھولنے لگا تھا۔ جب میں نے فرائیڈ کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو سیکس (جنسیات) کا خیال ہوا لیکن کلاس میں لڑکیاں ہونے کے باوجود میں کبھی ان کی طرف مائل نہیں ہوا۔ اس کی خاص وجہ شاید اور رہی ہو جس کا ذکر میں تیسرے باب میں کروں گا لیکن سوچنے کی بڑی عادت پڑ گئی۔ گھنٹوں بستر پر لیٹے رہتا اور سوچتا رہتا کہ آخر یہ دنیا کیوں ہے۔ یہاں اتنے مذاہب کیوں ہیں۔ یہاں انسان آپس میں کیوں لڑتے رہتے ہیں۔ کیا میں دوسرے انسانوں سے مختلف ہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو انسان کیوں علیحدہ علیحدہ گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ کیا ہم ان گروہوں کو ختم کر کے ایک انسانیت کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔ مجھے ہر مذہب کی کتاب میں مزا آتا ہے۔ کوئی بھی مذہب بری عادتیں نہیں سکھاتا۔ ہر مذہب میں اچھا انسان بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ہر انسان کو محبت کی باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ صبر اور تحمل کا سبق سکھتے ہیں۔ آخر پھر آپس میں یہ لڑائی کیوں۔ انگریز بھی انسان ہیں ان کے ادب میں بھی کتنی اچھی باتیں آزادی کے متعلق لکھی ہوئی ہیں۔ ہمارے امریکن استاد تو بہت شفقت کرتے ہیں۔ گرجا گھروں میں ان کی تقاریر بصیرت افروز ہوتی ہیں۔ میرے ساتھ ان کا رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔ میں نے ان سے بہت اچھی اچھی باتیں سیکھی ہیں۔ میرے گاؤں کے ہندو' مسلم' گونڈ اور اڑیا سبھی اچھے لگتے ہیں۔ تو پھر کیوں ہم مندر' مسجد اور گرجا گھروں میں جدا جدا جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ ایک ہے تو پھر ہم سب کو مل جل کر کیوں نہیں اکٹھے دعا مانگنی چاہیے۔

ان خیالات نے میرے دماغ کو چکرا دیا اور میں شبہ میں پڑ گیا کہ میں جو مسجد جاتا ہوں' گرجا گھر میں پادریوں کو سنتا ہوں' مندروں کی گھنٹیاں مجھے بلاتی ہیں' قرآن شریف' ہندو مذہب کی کتابیں اور بائبل پڑھتا ہوں تو ان کا کیا مطلب ہے۔ مجھے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ہو نہ ہو ہماری سمجھ میں کوئی غلطی ہے اور اس غلطی کے اسباب مجھے صرف انسان کی لکھی ہوئی تاریخ میں ملتے ہیں۔ کیا انسان اتنا بیوقوف ہے کہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے لڑنے لگتا ہے اور پھر اللہ کے سامنے جا کر برتری حاصل کرنے کی دعا مانگتا ہے۔ آخر کس سے برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان پر سبقت لے جانے کے لیے اگر یہ طاقت ہم اللہ سے مانگتے ہیں تو سراسر ہماری غلطی ہے۔ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ انسانی جھگڑوں میں شامل ہو۔ وہ سب کا مالک ہے۔ سب پر مہربان ہے۔ سارے انسان اس کے بندے ہیں۔ سب اس کے عبد ہیں۔ یہ سب انسانی ناسمجھی ہے کہ ہم آپس میں فرق محسوس کرتے ہیں۔ اگر اللہ ایک ہے تو انسانیت بھی ایک ہے۔ ہم کیسے اسے سمجھیں اور اس طرح اس کے پاس اکٹھے جائیں۔ ایک خالق کی ہم سب مخلوق ہیں اور وہ ہماری کسی چیز کا محتاج نہیں۔ ہم اس کے نام سے کھانے بانٹتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ ہم پر خاص مہربان ہوگا۔ ایسا کیوں ہوگا دوسرے انسان بھی تو اس کے بندے ہیں۔ ان پر کیوں نہ مہربان ہو۔ کیا میں نے اللہ کو اپنی مسجد میں ہی بند کر رکھا ہے یا ہندوؤں نے مندر میں گھیر لیا ہے۔ کیا وہ گرجا گھر میں نہیں ہے۔ اس کی تلاش میں میرا دماغ پھرنے لگتا ہے اور مجھے یہی جواب ملتا ہے کہ ہم سب غلطی پر ہیں۔ اس کی تلاش میں میں دن رات پریشان رہتا۔ اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔ نہ نیند آتی اور نہ چین۔ کیسے میں انسانیت کی راہ پر گامزن ہوؤں اور اپنے ساتھ سب کو لیتا چلوں اس خیال نے مجھے گمراہ کر دیا اور جب میں گیارہویں جماعت میں پڑھتا تھا سخت بیمار ہو گیا اور کئی مہینوں کے لیے بسنہ چلا گیا۔ علاج کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ نماز پڑھنے سے بھی قاصر رہا اور دھیرے دھیرے نماز کی عادت بھی چھوٹ گئی۔

بسنہ میں ایک وید ہوتا تھا جو علاج کے لیے دوسرے گاؤں سے ہمارے گھر آتا۔ نبض دیکھ کر دوا دارو دیتا۔ جڑی بوٹی سے وہیں تیار کرتا۔ کئی گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتا۔ اپنی مذہبی کتابوں

کا ذکر کرتا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں سنسکرت بھی پڑھتا ہوں جو وہ نہیں سمجھتا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مجھے کتابیں لا کر دیتا۔ اسی زمانے میں رامائن پڑھی اور بھگوت گیتا بھی پڑھ لیا۔ دوسری طرف میں نے اردو میں قصص الانبیاء کی کتاب منگوائی اور وہ بھی پورے طور سے پڑھ لی۔ روائتی تاریخ نے اور بھی سوچ میں ڈال دیا۔ ان کے بیان میں اور تاریخ کی کتابیں جو پہلے پڑھ چکا تھا، زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ کیا یہ روائتی خاکہ سچ نہیں تو تاریخی انسان کیا ہوتا ہے۔ کیا ان لیڈروں اور شاہوں کی طاقت اور دماغ ان کے برابر بڑے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیا میرا دماغ بھی ایسا بڑا ہو سکتا ہے۔ کیا وِمان کا کھٹولا سچ ہے۔ کیا میں خود بھی اُڑ سکتا ہوں نہ جانے کہاں کہاں کے خیالات مجھے ستاتے تھے اور میں اس فکر میں کمزور ہو گیا اور پھر سوچتا کہ ایک دن میں بھی ہوا میں اڑوں گا۔ دور دور جاؤں گا۔ میرا بھی سر بڑا ہو گا اور اونچے اونچے خیالات کا مالک ہوں گا۔ یہ سب باتیں بیماری کی حالت میں آئیں اور میرا دماغ تتر بتر ہو گیا۔ یادداشت خراب ہو گئی۔ جب بیماری دور ہوئی تو سکول واپس آیا۔ میرے ہم جماعتی مجھ سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ امتحان نزدیک آ گیا تھا۔ اسی حالت میں امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ سنسکرت میں اچھے نمبر بھی آئے لیکن وہ درجہ میں حاصل نہ کر سکا جس کی امید میرے اساتذہ کو تھی۔ میں خود بڑا مایوس ہوا لیکن ہمت نہیں ہارا۔ امتحان کے بعد چھٹیوں میں بسنہ آیا میں بہت چڑ چڑے مزاج کا ہو گیا تھا۔ والد صاحب سے ہمیشہ لڑتا رہتا تھا۔ ان کی تجارت میں کبھی ہاتھ نہیں بٹاتا تھا۔ ایک کمرے میں بند جو اوپر والی منزل میں تھا اکیلا بیٹھ کر کتابوں میں گم رہتا۔ یکا یک ایک دن خیال آیا کہ سیر کرنی چاہیے اور جو تاریخ میں نے پڑھی ہے ان کے شہروں کو آخر دیکھنا ضروری ہے۔ میں نے اپنے والد صاحب سے خواہش ظاہر کی اور ان سے پیسے مانگے۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ تجارت میں تو ہاتھ بٹاتا نہیں صرف خرچ ہی خرچ بتاتا ہے۔ میں بھی ضد میں آ گیا۔ کچھ پیسے ان سے لیے اور کچھ والدہ سے اور گھر سے نکل گیا۔ کوئی سمت نہیں تھی۔ بذریعہ ریل سیدھا ناگپور پہنچا۔ پرنسپل سے ملاقات کی اور مارس کالج میں داخلہ لے لیا۔ پھر وہاں سے حیدر آباد دکھن کی طرف روانہ ہوا وہاں بہت سارے مقامات دیکھے۔ یونیورسٹی بھی گیا، کوشش کی کہ بڑے وزیروں سے ملوں لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اس کے بعد میں سیدھا جبلپور پہنچ گیا۔ جہاں میرے والد صاحب کے پھوپھا جی ایم ڈی صوفی تعلیم کے انسپکٹر تھے۔ وہاں

میرے بڑے بھائی صاحب پہلے جا چکے تھے۔ انہی سے ان کا پتہ معلوم ہوا تھا۔ ان کے گھر پہنچ کر اپنی شناخت کروائی۔ انہوں نے کبھی مجھے دیکھا نہیں تھا۔ گھر میں اور کوئی فرد اس وقت نہیں تھا۔ میری بچکانی حرکات پر وہ بڑے حیران ہوئے لیکن میری ہمت کی داد دی اور کوئی نہ کوئی نئی کہانی مجھے سناتے۔ کشمیر کے متعلق کافی بیان کرتے۔ مجھے ان کے گھر میں بڑی کتابیں ملیں۔ ایک روز میں نے بڑی محنت سے انہیں ترتیب وار سجا دیا۔ ان کے میز کی بھی صفائی کر دی۔ کپڑوں کو ٹھیک طرح لٹکا دیا اور ان کے دفتر سے واپس آنے کے بعد ایک کونے میں بیٹھ کر پڑھتا رہا۔ واپس آ کر جب یہ سب کچھ دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے اپنے مستقبل کے متعلق پوچھا۔ طالبعلموں کا جیسے حال ہوتا ہے میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ اتنا بتایا کہ میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں نے مارس کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ چھٹیاں اب ختم ہونے کو آئیں۔ بسنہ واپس آیا اور والد صاحب سے مارس کالج کا ذکر کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سائنس پڑھوں۔ میں نے کہا کہ کالج میں حساب کا مضمون رکھا ہے۔ اس کے آگے میں نے کچھ نہیں بتایا۔

کالج کھلنے پر میں ناگپور آیا' یہ شہر بڑا تھا۔ رائے پور سے بالکل مختلف تھا۔ مراٹھی بولی جاتی تھی۔ چھتیس گڑھ اور ناگپور دو مختلف ثقافتی علاقے تھے۔ وہ گونڈوں اور چھتیس گڑھیا لوگوں کا علاقہ تھا جو کسی زمانے میں دکھن کوشل کے نام سے مشہور تھا جہاں کی خاص پیداوار چاول ہے کیونکہ یہاں مون سون کی بارش اچھی ہوتی ہے۔ ناگپور روئی کی کاشت کا علاقہ ہے۔ یہاں کی کافی زمین اس فصل کے لیے بہت مشہور ہے۔ یہاں گندم بھی پیدا ہوتی ہے اور یہاں کے سنگترے بہت مقبول ہیں۔ انگریزوں کی تاریخ میں سیتا بلڈی کی لڑائی کے متعلق میں نے پڑھا تھا۔ میرا کالج اسی نام کے علاقے میں واقع تھا۔ ہم اکثر سیتا بلڈی کے بازار اور باغ میں سیر کرنے جاتے تھے اور یہیں کے سینما گھر میں انگریزی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ مرہٹی عورتوں کا پہناوا رائے پور کی عورتوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ساڑھی کو بل دے کر پیچھے ٹک لگا دیتی تھیں۔ ناگپور شہر صوبہ کا دارلخلافہ تھا۔ اس کے نزدیک کامٹی میں ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ مرہٹوں کے علاوہ پارسی اور مسلمان کافی تعداد میں یہاں آباد تھے۔ روئی کے کپڑے بنانے کے کارخانے بھی کافی تھے۔ ان کارخانوں کی وجہ سے مزدور طبقہ کافی تھا۔ مسلم مزدوروں کی ایک مکمل کالونی تھی۔ مسلمانوں میں پڑھے لکھے اور افسروں

کے علاوہ بوہرے فرقے کے لوگوں کی دکانیں تھیں۔ جن میں سے ایک لڑکا عابد بھی میرا اہم جماعتی تھا۔ ایک دوسرا اہم جماعتی اعظم گڑھ کا رہنے والا تھا۔ اسی لیے اس کا نام عبدالحفیظ اعظمی تھا۔ تیسرا شریف تھا جس کا باپ 1938ء میں کانگرس میں شریک ہو کر وزیر بن گیا تھا۔ اسی زمانے میں پنڈت روی شنکر شکلا جو ہمارے خاندانی وکیل تھے، صوبے میں وزیر اعلیٰ ہو گئے تھے۔ ان ایک لڑکا بھی میرا اہم جماعتی تھا۔

کالج میں فضا پر لطف تھی۔ میں بالکل آزاد خیال ہو چکا تھا۔ میرے دوستوں میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی تھے۔ چونکہ کالج میں لڑکے لڑکیاں اکٹھی پڑھتی تھیں، اس لیے ہماری دوستی کے دائرے میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ہم دوست مل کر پکنک مناتے۔ باغوں میں جاتے اور سیر کرتے۔ میں کالج کے ہاسٹل میں رہتا تھا لیکن کالج میں مکمل آزادی تھی۔ کوئی سختی کا قانون نہیں تھا۔ یہاں دو میس (Mess) تھے ایک ہندوؤں کا جہاں صرف دال اور سبزی وغیرہ پکتے تھے اور دوسرا مسلمانوں کا جہاں گوشت اور انڈے بھی پکتے تھے۔ ہفتہ میں ایک روز پلاؤ بھی ملتا تھا لیکن اس کا مزا کشمیری کھانے سے بالکل مختلف تھا۔ مسلمانوں کے آداب ہندوؤں سے جدا تھے۔ ہم ایک دوسرے کو صاحب یا بھائی کہتے اور ایک دوسرے کے ساتھ بڑے ادب سے پیش آتے تھے۔ شاید اس لیے کہ مسلمان بچے زیادہ تر اچھے گھرانے کے یا سرکاری ملازم یا پھر زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر بھی ہماری دوستی ہندوؤں کے ساتھ کم نہ تھی۔ فرقہ وارانہ خیالات کم از کم ہم دوستوں کے گروہ میں بالکل نہیں تھے۔

یہاں بھی میں نے ہندی، سنسکرت، منطق اور انگریزی کے مضامین لیے۔ بعد میں فلسفہ لے لیا۔ لکھنے کی عادت مجھ میں پہلے ہی بن چکی تھی۔ شروع شروع میں ہمارے ہندو استاد نے ہم سب کو مقالہ لکھنے کو کہا۔ یہ ہندی زبان میں لکھنا تھا۔ مسلمان شاید میں اکیلا ہی ہندی پڑھتا تھا۔ سب مقالوں میں ہمارے استاد نے تین مقالے چنے اور نمونے کے طور پر انہیں پڑھ کر سنایا اور ان کی بڑی تعریف کی۔ ان میں سے ایک مقالہ میرا بھی تھا۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ میں پھر بیمار ہو گیا اور بسنہ واپس جانا پڑا۔ چھ ماہ تک گاؤں میں رہا۔ میرے ہم جماعتی یہ سمجھنے لگے کہ میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ بیماری بڑی سخت

تھی۔ پھر مزید علاج ہوا میں کمزور ہوتا ہی گیا۔ اس کمزوری میں بھی پڑھنا نہیں چھوڑا۔ ویدی کے ساتھ ہندو مذہب اور روایت پر بڑی بحث ہوتی تھی۔ اسی موقع پر اس نے مجھے سنسکرت زبان میں پوری مہا بھارت لا کر دی۔ وقت میرے پاس کافی تھا اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔ اس کی ساری جلدوں کو میں بڑے آرام سے پڑھ گیا۔ اس کتاب نے میری آنکھیں کھول دیں اور پہلی دفعہ ایک نئی دنیا میرے سامنے اُجاگر ہوئی۔ اس مرتبہ ہندو مذہب نہیں بلکہ ہندو تہذیب اور روایات کے بھنڈار کھل گئے۔ میرے ہاتھ بھارت کے دیس واسیوں کا خزانہ آ گیا۔ بھارت ورش سے میری محبت بڑھ گئی اور مجھے خیال ہوا کہ میرے آباؤ اجداد کیسی کتاب مرتب کر سکتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر بڑا فخر محسوس ہوا کیونکہ مجھے علم تھا کہ میرے بھی جید امجد مسلمان ہونے سے پہلے برہمن تھے۔ اب میرے علم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ میں جو پہلے اسلامی مذہب میں گم تھا اس میں تھوڑا تھوڑا عیسائی اور ہندو جھلکیاں سمو گئی تھیں۔ اب ایسا محسوس ہوا کہ میرے سامنے ساری دنیا ابھر آئی ہے۔ اس بیماری نے مجھے ایک نیا آدمی بنا دیا۔ میں اب محدود خیالات سے بالکل باہر آ گیا تھا اور میرے ہاتھ وہ علم کی شمع آ گئی جس کی بدولت میں اب سب لوگوں کے ساتھ باتیں کر سکتا تھا۔ سب پرانے بند ٹوٹ گئے اور میرا دماغ پورے طور سے آزاد ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں ایک سچا انسان ہوں اور اسی انسانیت کے بل بوتے پر مجھے دنیا میں آگے بڑھنا ہے۔

ان سارے علوم کا بوجھ اٹھا کر اور آزاد خیالات کے ساتھ میں دوبارہ ناگپور آیا اور اپنے پرانے دوستوں سے ملنے لگا۔ سب مجھے بھول چکے تھے۔ دوبارہ دوستی کا سلسلہ شروع ہوا لیکن کلاس کے اندر بڑی دشواری ہوئی۔ چھ ماہ میں میرے ہم جماعتی کافی آگے نکل گئے تھے۔ باقی مضامین میں میں نے کچھ نہ کچھ کر لیا تھا لیکن حساب میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میری دلچسپی اس مضمون سے کم ہوتی گئی اور میں دوسرے مضمون تاریخ' جغرافیہ' اقتصادیات اور سیاسیات کی کتابیں پڑھنے لگا۔ دنیا کی تاریخ سے میرا بہت لگاؤ تھا۔ میں نے نہرو کی کتاب "Glimpses of world History" ' ایچ۔جی ویلس کی ''دنیا کی تاریخ''، گبسن کی "Decline and fall of pomanempive" یونان کی تاریخ' میسوپٹیمیا' مصر کی قدیم تاریخ اور چین کی تاریخ پر بھی جو کتاب میرے ہاتھ لگتی میں پڑھ جاتا۔ اس زمانے میں پبلیکن (Peblicon) اور پینگوئین

(Penquin) کی نئی کتابیں شروع ہوئی تھیں۔ ہم دوستوں میں یہ مقابلہ ہوتا کہ کون ان کتابوں کو سب سے پہلے پڑھتا ہے اور ان پر بحث میں شامل ہوسکتا ہے۔ ہم خود بھی یہ سستی کتابیں خریدتے اور پھر آپس میں تبدیل کرلیتے۔ اس طرح علم عامہ کا بڑا اضافہ ہوتا چلا گیا اور ہمارا ایک چھوٹا سا علمی دائرہ بن گیا جو آپس میں کافی علمی بحث مباحثہ کرتے تھے۔ ادھر دوسری طرف سنسکرت پر کافی زور دیا۔ وی وی مراشی(V.V.Mirashi) جو کہ میرے استاد تھے بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ وہ سنسکرت زبان میں مباحثہ کراتے۔ کلاس میں سکے لاکر ہمیں دکھاتے۔ پرانے کتبے بھی دکھایا کرتے چونکہ قدیم تاریخ سے انہیں لگاؤ تھا ہم سب کو اس کی طرف مائل کرتے۔ میں بھی اپنی علم دوستی کی وجہ سے ان کے قریب ہوگیا۔ وہ خود مرہٹے تھے اور میرے بہت سارے ہم جماعتی مرہٹے لڑکے لڑکیاں ہوتی تھیں۔ میں نے بھی ناگپور میں میراٹھی لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا اب بھی سنسکرت پڑھتا رہا اور ساتھ فلسفہ بھی لے لیا۔ گو کہ میں نے انگریزی ادب کا کورس بھی لیا لیکن ادب سے اتنا لگاؤ نہیں ہوا۔ میراٹھی مضمون سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ میراٹھی زبان میں مرہٹوں کی ساری تاریخ پڑھ گیا۔ جب میں بی اے میں داخل ہوا تب بھی سنسکرت پڑھتا رہا۔ بس صرف تاریخ سے دلچسپی بڑھتی گئی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تاریخ میں نے درسی جماعت میں نہیں لی تھی۔ گبسن کی کتاب نے مجھے بڑا متاثر کیا اور میں قوموں کے زوال اور ان کے ابھرنے پر غور کرنے لگا۔ اسی دوران ابن خلدون کی کتاب کا ترجمہ میرے ہاتھ لگا۔ میں نے وہ بھی پڑھا اور سوچنے لگا کہ انسانی تہذیب کیسے بنتی ہے۔ کیوں بگڑتی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ انسان زوال پذیر ہو اور بہت سارے سوال میرے ذہن میں آئے جن کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

آپس میں ہماری بڑی بحث ہوئی لیکن ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے تھے۔ میرے دوستوں کے کئی حلقے تھے۔ ایک وہ جن کے ساتھ میں پکنک مناتا تھا، باغوں میں جاتا تھا، سینما دیکھتا تھا۔ دوسرا وہ جن کے ساتھ علمی بحث اور مباحثہ کرتا تھا۔ تیسرا وہ جو میرے ہم جماعتی تھے اور جن سے میں زبانوں پر اور فلسفہ پر بحث ومباحثہ کرتا تھا۔ چوتھا وہ جن کو پڑھنے لکھنے میں دلچسپی نہیں تھی لیکن چونکہ وہ اچھے گھرانوں سے آئے تھے وہ بہت ہی ملنسار تھے۔ ملنے ملانے، ہوٹلوں میں جانے، کھانا کھلانے میں بہت زیادہ لگے رہتے تھے اور ساتھ ہی کالج کی سیاست میں لگے رہتے تھے۔ اس

گروہ کے ساتھ بھی میری دوستی تھی لیکن جس سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں بی۔اے میں پڑھتا تھا۔ان پاشترا ایک کا بڑا اثر تھا۔یہ متحد ہو کر کام کرتے اور ہوشیار لڑکوں کو اپنے ساتھ ملاتے۔اسی زمانے میں ان کا اثر مجھ پر بھی پڑا۔

پہلے گروہ کے ساتھ میں کافی وقت گزارتا۔ان لڑکے اور لڑکیوں کے گھروں میں جاتا جو میرے قریب تھے۔ان کے ساتھ سفر بھی کرتا۔دوسرے شہر بھی جاتا۔چھٹیوں میں ان کے گھر کئی دن گزارتا اور ان کے ساتھ دوستیاں نبھاتا۔ایک مرتبہ ہم چار دوست ناگپور سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔میں پہلی دفعہ بمبئی گیا۔میرے عابد علی صاحب جو بوہرے تھے۔وہاں جا چکے تھے۔ان کے پاس کافی روپیہ پیسہ تھا۔میرے والد صاحب کی سخت گیری ہمیشہ مجھے پریشان کرتی رہتی تھی۔پھر بھی میں والد صاحب سے رقم لے کر اپنا خرچہ پورا کر لیتا تھا۔بمبئی میں ہم سب سی ویو ہوٹل (Sea view hotel) میں ٹھہرے۔جب کرایہ پوچھا تو ہوٹل والے نے کمرہ کا کرایہ قریب میں پڑے ہوئے ایک پلنگ کا بتایا۔ہم نے ایک کمرہ لینے کا فیصلہ کیا۔ہم چاروں نے پلنگ باہر نکال کر فرش پر ہی بستر ڈال دیے۔ہم کھانا وہاں نہیں کھاتے تھے۔صبح ہی پیدل نکل جاتے اور جہاں کہیں بھی سستی دکان نظر آتی کھانا کھا لیتے۔رات میں دیر سے آتے اور سو جاتے۔واپسی پر ہوٹل والے سے خط لکھنے کا پیڈ مانگ لاتے۔رات کو میں اس پر اپنے سفر کی کہانی لکھتا اور بڑے مزے لے کر دوستوں کو سناتا۔اسی دوران ایک دن مجھے یہ سوجھی کہ گجراتی زبان سیکھنی چاہیے۔بچپن میں یہ زبان سن چکا تھا اور سمجھنے بھی لگا تھا لیکن پڑھنے لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔میں ایک روز جب ہم سب لوگ ہوٹل سے نکلے تو میں دکانوں کے نام انگریزی اور گجراتی میں پڑھتا گیا۔میرے دوست ہنستے تھے اور مذاق کرتے تھے لیکن شام تک میں نے روانی کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا۔واپسی پر میں نے ایک گجراتی اخبار خرید لیا اور پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔اب روزانہ ہوٹل کے گجراتی اخبار پڑھتا اور باقاعدہ بولنے کی کوشش بھی کرتا۔ہم جہاں پر ٹھہرے تھے وہ مسلم ہوٹل تھا۔ہم چاروں دوست بھی اتفاقاً مسلمان تھے۔ایک دن میں نے اپنے دوستوں کو لاہور کے مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی میٹنگ کے متعلق اخبار پڑھ کر سنایا۔ہم سب کو دلچسپی ہوئی کہ محمد علی جناح سے ملتے ہیں۔واپسی سے ایک روز پہلے ہم ہوٹل سے نکلے اور پیدل سیر کرتے کرتے سیدھے ملابار ہل

پر پہنچے جہاں جناح صاحب کی کوٹھی تھی۔ ڈرتے ڈرتے اندر آئے کہ شاید ملاقات کا شرف حاصل ہو لیکن جناح صاحب اس روز بمبئی میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ہم سب کو بڑی مایوسی ہوئی اور ہوٹل واپس آ گئے پھر دوسرے روز ناگپور کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ میرا پہلا قدم کسی سیاست دان سے ملنے کے لیے تھا۔ گو کہ میں ناگپور میں پڑھتا تھا اور وہاں سے وردھا بہت قریب تھا۔ جہاں مہاتما گاندھی قیام کرتے تھے۔ میرے بہت سے دوست ان سے ملنے جاتے لیکن میں خود کبھی نہیں گیا۔

اب اشتراکی دوستوں نے مجھے گھیر لیا اور اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ اشتراکیت پر بہت ساری کتابیں مجھے دیں۔ میں ان کا غور سے مطالعہ کرتا۔ ایک میرا مسلمان دوست جس کا نام مشتاق تھا ہمیشہ مجھے کھینچ کر اپنے اجلاس میں لے جایا کرتا۔ ایک دوسرے دوست بھونا مکرجی تھے جو مزدوروں کے عملی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ میرے ہم جماعتی نیل رتن بینرجی کے ماموں تھے۔ یہ بینرجی وہی شخص تھا جنہوں نے بعد میں آثاریات کے محکمہ میں نوکری کر لی تھی۔ اسی دوران روزانہ میرے تکیہ کے نیچے ایک ہندی رسالہ ملتا جس میں ہندوستان میں اشتراکیت کے متعلق لکھا ہوتا۔ میں اسے بغور پڑھتا۔ اسی اثناء میں ایک بڑے جلسے میں شریک ہونے کے لیے میں جبلپور گیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سیاسی مجمع میں شریک ہوا۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر کے ایم اشرف کر رہے تھے۔ اسی دوران دوستوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں طلبہ یونین کے الیکشن میں حصہ لوں۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس قسم کا کام نہ کیا تھا لیکن چونکہ ان اشتراکیت پسند دوستوں کو میری مقبولیت کا علم تھا انہوں نے مجھے سیکرٹری کے عہدہ کے لیے نامزد کیا۔ میں اس شرط پر تیار ہو گیا کہ کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہ کرے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میں واحد امیدوار تھا۔ اس طرح میں سیکرٹری بن گیا۔ اب کھلم کھلا یونین کا کام کرنا پڑا۔ مزدوروں کی جماعتوں میں جانا پڑا اسی دوران کامریڈ ڈانگے سے میری ملاقات ہوئی۔ میں پڑھنا لکھنا چھوڑ کر ان کے کام میں لگ گیا۔ بی۔اے کے امتحان کا وقت آیا لیکن ڈاکٹر کے ایم اشرف ناگپور آنے والے تھے۔ ان کے آنے کا مقصد مزدوروں کی ہڑتال کرانا تھا۔ میری ڈیوٹی لگی کہ میں ناگپور کے مسلم مزدوروں کا ایک جلسہ کرواؤں اور ڈاکٹر اشرف کو وہاں لے جاؤں۔ وہاں ساری رات محنت

کرنا پڑی اور کام ختم کر کے صبح صبح واپس آیا۔ اسی دن دس بجے میرا بی۔اے سنسکرت کا پرچہ تھا۔ بغیر پڑھے میں امتحان میں چلا گیا۔ ظاہر ہے مجھ سے کیا ہونا تھا۔ تھوڑا بہت کر لیا لیکن میرے استاد میری حرکت سے خوش نہ ہوئے۔ میراشی صاحب نے مجھے بہت سمجھایا اور پڑھنے کی طرف توجہ دلائی۔ مشورہ یہی دیا کہ میں ناگپور چھوڑ کر بنارس چلا جاؤں تا کہ وہاں سنسکرت سے فائدہ اٹھاؤں اور پوری طرح سے ہندوستان کی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کروں۔

تیسرے گروہ کے ساتھ بھی میرا گہرا لگاؤ تھا۔ یہ سرکاری ملازم اور زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ہندو' پنجابی' سکھ' مرہٹے' مسلمان' برہمن کا سیتھ وغیرہ شامل تھے۔ ان سب کے گھروں میں جاتا اور ان کے بھائی بہنوں سے ایسے ملتا جیسے کہ میں انہیں کے گھر کا فرد ہوں۔ چونکہ میں سنسکرت پڑھتا تھا اور ہندو تاریخ و روائت سے کافی شناسائی تھی۔ میرے مرہٹے دوست مجھے گھروں میں دعوت دیتے اور اپنے ماں باپ سے ملاقاتیں کراتے۔ گھنٹوں ان کے گھروں میں بیٹھ کر باتیں ہوتیں۔ دتہ (Dutta) نام کا ایک بنگالی دوست بھی تھا۔ اس کے گھر اکثر میں چلا جاتا اور شام کے وقت اس کے گھر میں جو کیرتن گایا جاتا اس میں شریک ہوتا۔ ایک مسلمان دوست اعظمی صاحب کا گھر سیتابلڈی کے باغ میں تھا۔ اس کے والد محکمہ زراعت میں ملازم تھے۔ کئی چھٹیاں میں نے ان کے گھر میں گزاریں اور ایسے وہاں رہتا جیسے کہ میں انہی کا بھائی ہوں۔ میرے ایک برہمن دوست جن کا نام دویدی تھا۔ ہوشنگا باد کے رہنے والے تھے۔ اس کے ساتھ میری بڑی دوستی تھی چونکہ ان کا شہر نربدا دریا کے کنارے واقع تھا۔ وہاں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس دریا کے کنارے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ اس میں بہت سی گھاٹیئے تھیں۔ دریا میں غوطہ لگاتے اور گھاٹیوں میں چھان بین کرتے۔ کس کی تلاش تھی یہ نہیں سمجھتے تھے۔ میں دویدی کے گھر میں کئی کئی دن گزارتا۔ ان کی برہمن والدہ چھوت چھات کا بڑا خیال رکھتی تھیں لیکن میرے ساتھ بڑے پیار سے پیش آتی تھیں گو کہ ان کے رسوئی گھر میں کسی غیر برہمن کو جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن میں اس سے مستثنیٰ تھا۔ میں دویدی کے ساتھ رسوئی گھر میں چلا جاتا۔ فرش پر وہیں بیٹھ جاتا۔ لکڑی کی چوکی پر تھال میں اس کی والدہ مجھے ویسے ہی کھانا دیتی جیسے وہ اپنے لڑکے کو دیتی تھیں۔ مجھے پیار کرتیں اور اپنا لڑکا ہی سمجھتی تھیں۔ جب میں جانے لگا تو نزدیک بلا کر مجھ سے کہا کہ اس کے پاس

پیار کے سوا اور کوئی چیز دینے کے لیے نہیں ہے۔ میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہنے لگیں کہ بیٹا تم مجھے بھول گئے تو نہیں' بڑھاپے میں تم کیا میرا سہارا بنو گے۔ میرا جی بھر آیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ میری ماں میرے سامنے کھڑی ہے اور مجھ سے الوداع کہہ رہی ہے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ پھر ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔

اسی دوران میں نے دویدی سے کہا کہ میں اُسے کشمیر دکھاؤں گا۔ جب بی۔اے کا امتحان ختم ہو گیا' چھٹیوں میں بسنہ گیا۔ والدہ صاحبہ سے ذکر کیا کہ میں اپنی بڑی بہن کے پاس امرتسر جانا چاہتا ہوں اور وہاں سے شہر جاؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور ڈرتے ڈرتے میرے والد صاحب سے ذکر کیا۔ والد صاحب بڑے ناراض ہوئے کہ میں ہمیشہ خرچ کی باتیں کرتا ہوں محض سیر ہی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آگے نہیں پڑھنا نائب تحصیلداری کی نوکری کرنی ہے تاکہ یہ جو افسران رائے پور سے مہاسمند سے یہاں آتے ہیں اور انہیں مفت کا رسد اور بیگار کا کام کرنا پڑتا ہے اس سے تو نجات حاصل ہو۔ مجھے یہ نوکری منظور نہیں تھی۔ میں آگے پڑھنا چاہتا تھا۔ والد صاحب مجھے رائے پور لے گئے اور سیدھے وکیل احمد رضوی صاحب کے گھر پہنچے۔ یہ اس شہر کے بڑے مشہور وکیل تھے۔ میرا قصہ انہیں سنایا اور کہا کہ میں کس طرح سیر کا شوقین ہوں' وقت ضائع کرتا ہوں' نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے ایک مثال میرے چچا کی دی جن کا نام غلام حسین دانی تھا۔ اس وقت وہ فوت ہو چکے تھے۔ میرے دادا نے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے علیگڑھ بھیجا تھا لیکن وہ علیگڑھ چھوڑ کر بسنہ آ گئے تھے۔ انگریزوں کی نوکری کرنے سے انکار کر دیا۔ میں کئی دفعہ ان کے پاس گیا اور ان سے باتیں کرتا۔ بہت کچھ سیکھتا۔ وہ ہمیشہ کہتے کہ ہمارے خاندان والوں نے کبھی انگریز سرکار کی نوکری نہیں کی اور مجھے بھی ترغیب دیتے کہ میں بھی ان کے نقش قدم پر چلوں۔ یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد وہ انتقال فرما گئے۔ اب زمانہ بدل گیا تھا۔ وکیل صاحب نے شفقت سے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور میرے اپنے مستقبل کے متعلق مجھ سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ فی الحال میں نوکری نہیں کرنا چاہتا اور تعلیم کو آگے جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کیا کرو گے۔ اس کا جواب میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ آخر میں نے کہا کہ میں بھی آپ کی طرح وکیل بننا چاہتا ہوں۔

اس پر وہ خوش ہوئے۔ میرے والد صاحب بھی خوش ہوئے اوران کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ میں وکیل بن کر بعد میں کم از کم زمین کے جھگڑے تو ختم کرسکوں گا۔ وہیں فیصلہ ہوا کہ فی الحال مجھے امرتسر جانے کی اجازت دی جائے۔

میں بھی خوش ہوا کہ آخر جیت میری ہوئی۔ اب تیاری ہونے لگی۔ والدہ صاحبہ نے بہت سی چیزیں بڑی بہن کے لیے دیں۔ چپکے سے کافی رقم بھی دی۔ والد صاحب نے امرتسر کا خرچ دیا اور میں ریل کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ جب دہلی پہنچا تو یاد آیا کہ میں نے دویدی سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ فوراً اتر گیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے ایک ہوٹل میں پایا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ اب ہم دونوں کشمیر چلیں گے۔ میں نے امرتسر چلنے کو کہا اور اپنے والد صاحب کی باتیں دہرائیں۔ مجھے اجازت صرف امرتسر کے لیے ملی تھی اس لیے میں کوئی گرم کپڑے ساتھ نہیں لایا تھا اور نہ ہی پیسے اتنے تھے کہ کشمیر جاسکوں۔ یہ بہانا اس نے بالکل نہیں سنا اور ہم دونوں روانہ ہوگئے۔ پہلے امرتسر گئے۔ چٹے کٹڑے میں میری بہن تاج بیگم کے گھر ہم دونوں ٹھہرے۔ دویدی پہلی مرتبہ پنجاب آیا تھا گو کہ یہاں پر گرمی تھی۔ نہروں میں نہانا اور باغوں کی سیر نے اسے بہت متاثر کیا۔ پھلوں کی بہتات تھی۔ پوڑی اور حلوے اسے بہت پسند آئے تھے۔ صرف ایک چیز سے وہ نالاں تھا۔ میں یہاں بھی اس کو اپنے رشتہ داروں کے گھر لے جاتا یا بازار میں دوستوں سے ملاتا۔ ایک بڑا سا گلاس دہی کی لسّی کا یا شکنجبین پینے کو مجبور کرتا۔ اس زمانہ میں نہ کوکا کولا تھا اور نہ ہی سیون اپ۔ پنجاب میں یہ دو مشروب بہت مقبول تھے۔ مجھے یہ پینے کی عادت تھی لیکن وہ تنگ آجاتا۔ جب میں اُسے اپنی بوڑھی پھوپھی شاہ زمانی کے گھر مہا سنگ کٹڑے لے گیا تو وہ پہلے دہی کی لسّی گڑوی میں بھر کر لے آئیں۔ جب دویدی نے معذرت کی تو انہوں نے پنجابی میں کہا کہ "ہے ماہے تجھے کی ہویا اے بیٹے گرمیوں میں لسّی چنگی ہوندی اے، پیون نال ٹھنڈک پہنچ دی اے۔" جب دویدی نے صحت کی بات کی تو وہ جا کر کاڑھی ہوئی نمکین چائے لے آئیں اور ساتھ باقر خانی بھی۔ جب دویدی نے چائے منہ میں لی تو کہا یہ کیا چائے ہے اس میں تو نمک ملا ہے۔ یہ تم کیسے پیتے ہو۔ پھوپھی صاحبہ غصہ میں آگئیں اور زور سے کہا یہی تو اصلی چائے ہے جو کشمیر میں پی جاتی ہے۔ اسے ضرور پیئو اور ابھی سے عادت ڈال لو۔ جب ہم آنے لگے تو پھوپھی صاحبہ نے ہم دونوں کو انعام

دیئے اور پیار کیا۔ دویدی بڑا خوش ہوا اور کہنے لگا کہ اس کا بھی دل یہیں رہنے کو کرتا ہے۔ تمہارے گھر والے اتنی محبت والے ہیں میں تو تمہارے ہی گھر کا ایک فرد بن گیا ہوں۔ ایک رات ہم چھت پر سوئے ہوئے تھے کہ یکا یک میری آنکھ کھل گئی اور دیکھتا کیا ہوں کہ دویدی بستر پر بیٹھا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تم کو کیا ہو گیا۔ سوتے کیوں نہیں ہو۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا سنتے نہیں ہو کتنی اچھی ڈھولکیاں بج رہی ہیں اور اتنی اچھی آواز میں پنجابی گانے گائے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ شادی کے گانے ہیں یہاں پر اس موقع پر لڑکیاں اسی طرح گاتی بجاتی ہیں۔ اس نے وہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے سمجھایا یہ ہوشنگ آباد نہیں یہ کشمیریوں کا محلہ ہے۔ کہیں شادی ہو رہی ہے۔ ہم وہاں ان لڑکیوں کے بیچ نہیں جا سکتے۔ مار پڑے گی اب خاموشی سے سو جاؤ۔

دوسرے روز ہم گھر سے نکلے سیدھے راولپنڈی کے راجہ بازار گئے اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر سرینگر کے لیے روانہ ہوئے۔ دیر ہو گئی تھی۔ راستہ میں ایک رات گزارنی پڑی اور دوسرے دن بارامولا سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچے۔ راستے کے مناظر بہت سہانے تھے۔ قطار در قطار بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان کے دامن میں سرو کے درخت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے سرو کے باغات لگا دیئے ہوں۔ کہیں کہیں روئی کے گالوں کی طرح بادل چل رہے تھے۔ ہم سوچتے تھے کہ کیا یہ پانی کے بادل ہیں یا سفید روئی کے ڈھیر ہیں جو ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ جب ہماری بس پہاڑ سے ڈھلوان کی جانب آئی تو بادل اور نزدیک آ گئے اور ہماری بس ان بادلوں کو چھو کر گزرتی گئی۔ دویدی نے ہاتھ باہر نکالا کہ ان کو پکڑے، کنڈیکٹر نے زور سے آواز دی کہ ہاتھ باہر نہ نکالیں اور چپ ہو کر بیٹھے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد بس کھڑی ہوئی۔ ایک چائے کی دکان نظر آئی۔ ہم نے خطائی خریدی اور میٹھی چائے بنانے کو کہا۔ چائے تو پی لیکن دویدی کو چائے پینے کا مزہ نہیں آیا۔ بس پھر روانہ ہو گئی اور ہم سرینگر پہنچ گئے۔ ہم نے پہلے سوچا کہ ہاؤس بوٹ کے اندر ڈل لیک کے اندر ٹھہرا جائے۔ پھر خیال آیا کہ روزانہ شکارے پر آنے جانے میں پیسے خرچ ہوں گے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہوٹل میں ہی ٹھہرا جائے موسم بڑا سہانا تھا۔ گرمی بالکل نہیں تھی۔ کبھی کبھی تھوڑی بارش ہو جاتی تھی۔ ہم کبھی پیدل، کبھی ٹانگہ اور کبھی شکارے پر خوب سیر کرتے۔ باغوں میں جاتے اور خوب مزے سے درختوں سے توڑ کر

لال لال سیب کھاتے۔ گلاس یعنی چیری کا بڑا مزہ آتا۔
ہم دونوں سیروں کے سیر کھا جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ بھی نہیں کھایا۔ کبھی کسی آبشار کے نیچے بیٹھ کر اسٹابری (Istaberry) کھاتے۔ دن دن بھر شالیمار باغ میں گزارتے۔ یہ شاہ جہاں کے وقت کا مصنوعی باغ ضرور تھا لیکن اس کے فوارے اور تہ بہ تہ نیچے آتے ہوئے پانی کی نالیاں بڑی سہانی لگتیں۔ خاص کر اس کے پیچھے کا منظر جو برفیلے پہاڑوں سے کٹ کر اسی کے دامن میں چشمے پھوٹتے تھے بڑا ہی دلکش ہوتا۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا کہ قدرت اور انسان کی کارکردگی (گزاری) دونوں جڑ کر ایک نئی امنگوں کی راہ کھول رہی تھیں اور جب کبھی سورج کی کرن اُن پر پڑتی تو سونے پر سہاگا کا کام کرتا۔ سامنے گول دائرے میں آبشار، پیچھے پہاڑی اور اس میں سے بہتے ہوئے چشمے، اِدھر اُدھر پھولوں کی کیاریاں۔ درمیان میں گھاس کے میدان اور بیچوں بیچ پانی کی نہر دوڑتی تھی اور دور سے جب کبھی کوئی دوشیزہ آتی ہوئی نظر آ جائے تو دویدی اپنا کیمرہ سیدھا کرتا اور کوشش کرتا کہ کم از کم ایک تصویر تو کھینچ لی جائے۔ میں اُسے روکتا اور کہتا کہ ایسا نہ کرو ہم دونوں کی شامت آ جائے گی۔ کبھی چپکے سے ہم آنکھ چراتے کبھی ان پر نظر دوڑاتے، پاس سے گزر جاتے اور اس کے بعد کبھی نسیم باغ کی طرف، کبھی ہارون لیک کی طرف اور کبھی تخت سلیمان کی پہاڑی پر چڑھ جاتے جہاں سے شہر کا خوبصورت منظر دیکھتے پھر ہم سرینگر میں پھلگاؤں چلے گئے۔ راستہ میں اسلام آباد کا شہر آیا۔ وہاں مارتنڈ مندر کے کھنڈرات دیکھے۔ پہلگام میں گھوڑے کی سواری بہت کی۔ ہم دور گھوڑوں پر نکل جاتے۔ پہاڑیوں کی پگ ڈھنڈیوں میں گھوڑے دوڑاتے۔ کبھی نزدیک کے دریا میں برفیلے پانی کی ٹھنڈک میں ڈبکی لگاتے یا کسی چھوٹی بستیوں میں نکل جاتے اور محنت کش کشمیریوں کی بری حالت پر رحم کھاتے۔ یہاں سے پھر ہم گلمرگ کی طرف گئے۔ اس زمانے میں ہم راستہ میں ہی بس سے اترتے تھے اور پھر گھوڑے پر بیٹھ کر گلمرگ جاتے تھے۔ یہاں کا منظر زیادہ دلکش تھا۔ کیونکہ ساتھ ہی برفیلے پہاڑ بڑے سہانے لگتے۔ ایک دن ارادہ کر کے صبح صبح ہم مولن مرگ کی طرف چل نکلے۔ پیدل چلتے گئے۔ تمام راستے گلاب نے پھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے گلاب ہی گلاب ہماری خوش آمدید کے لیے بچھا رکھے ہیں۔ پہاڑی کے اوپر پہنچ کر برف پر کھڑے ہو گئے۔ نیچے

تک برف ہی برف پھیلی ہوئی تھی۔ سکیئنگ کرنے کا خیال آیا لیکن ہمارے پاس سکیئس نہیں تھے۔ ہم دونوں بیٹھ کر ہاتھ میں ہاتھ پکڑے ویسے ہی پھسلنے لگے۔ آخر ہماری پینٹ نیچے سے بالکل پھٹ گئی تھی۔ قمیض نکالی اور اُسے باندھ کر ہوٹل واپس آئے۔

کافی دن گزر گئے تھے میں نے دویدی سے کہا کہ اب واپس جانا چاہیے۔ بی۔اے کا نتیجہ بھی نکل چکا تھا۔ کہیں داخلہ لینا ہوگا۔ سرینگر واپس آ کر میں نے ایک درخواست بنارس یونیورسٹی بھیجی۔ پنجاب کا دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جموں سے گزر کر سیالکوٹ جانے کا ارادہ کر کے بس میں بیٹھ گئے۔ اب بھی دو دن لگ گئے۔ اس میں ایک ڈوگرا ہمراہی تھا۔ اسے گانے کا بڑا شوق تھا۔ راستہ بھر وہ ہیر رانجھا سناتا گیا۔ راستہ کٹ گیا لیکن اس کی داستان نہ ختم ہوئی۔ دویدی کو ہمارا کشمیر چھوڑنا پسند نہ آیا اور اس نے پوچھا کہ ہم لوگ کشمیر جیسے ملک کو چھوڑ کر چھتیس گڑھ کیوں گئے۔ میں نے جب اپنے خاندان کی کہانی سنائی اور ڈوگروں کی زیادتیوں کا ذکر کیا تو جو ڈوگرا ساتھ بیٹھا تھا اس نے منہ چھپا لیا اور اپنا سریلا گیت بند کیا۔ میں نے اس سے کہا یہ تمہارا قصور نہیں یہ تاریخ کا معمہ ہے جسے ہم دونوں مل کر سلجھا سکتے ہیں۔ ہم سب انسان ہیں۔ اسی دنیا میں ہم سب کو رہنا ہے۔ یہ دیکھو دویدی میرا ہندو دوست ہے لیکن کس پریم ومحبت سے ہم نے مل کر کشمیر کی سیر کی۔ ہم اب واپس جا رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں اس پیار کے پیغام میں ہم سب بچھڑے اور اپنا نیا راستہ اختیار کیا۔

والد صاحب کو اطلاع دیئے بغیر میں امرتسر سے بنارس کے لیے روانہ ہو گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنی پردادی کے لڑکے عباداللہ گیانی جنہیں میں چچا کہتا تھا ان سے میں نے مشورہ کیا وہ میرے بنارس جانے پر بڑے خوش ہوئے کیونکہ انہیں بھی مختلف مذاہب کو موازنہ کرنے کا شوق تھا۔ تھوڑی تھوڑی ہندی اور سنسکرت بھی سیکھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بنارس میں ایک ملنے والے کا پتہ دیا جہاں میں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے۔ کشمیری تھے اور احمدی تھے۔ بڑے سخت مزاج کے انسان تھے۔ مجھے دیکھ کر خوش تو ہوئے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں ہندو یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے آیا ہوں تو بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ کیا اور کوئی مسلمانوں کی جگہ نہیں ہے کہ انہیں چھوڑ کر اس کفرستان میں آنا چاہتا ہوں۔

میں نے اپنی تعلیم کا ذکر کیا اور عرض کی کہ میرا مقصد صرف علم حاصل کرنا ہے اور جس طرح میں نے پڑھا ہے اس میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں بہرحال وہ خوش تو نہیں ہوئے پر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں پہلی دفعہ بنارس آیا تھا۔ اس شہر کی مسلم گلیوں کے اندر ان کی رہائش تھی۔ ان گلیوں کو پار کر کے میں بازار خاص میں آیا اور وہاں ٹم ٹم میں سوار ہو کر یونیورسٹی کی طرف رخ کیا۔ داخلہ شروع ہو گیا تھا۔ سارے ہندوستان سے لڑکے لڑکیاں آ رہے تھے۔ میں رجسٹرار صاحب کے دفتر سے ہو کر اپنے شعبے کے چیئرمین کے گھر پہنچا۔ اس یونیورسٹی کی عمارت دوسری یونیورسٹیوں سے مختلف تھی۔ عمارتیں مندر نما معلوم ہوتیں۔ ان کا ڈیزائن بھی جداگانہ تھا۔ یہ ایک نیم گول دائرہ کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ درمیان میں دفاتر، لائبریریاں اور کانوکیشن کی جگہ تھی۔ اس کے بعد مختلف کالج اور شعبے پھر کھیل کے میدان آئے، اس کے بعد ہاسٹل کی قطار اور سب سے پیچھے استادوں کے گھر آئے۔ میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنے بڑے استاد ڈاکٹر اے ایس الٹیکر کے گھر پہنچ گیا۔ انہیں میرے پرانے استاد مراشی صاحب کا خط مل چکا تھا۔ مجھ سے تاریخ کے دو چار سوال کیے۔ سنسکرت میں دو چار نظمیں سنیں اور بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تمہارا داخلہ بس ہو گیا۔ پھر وہ مجھے وائس چانسلر سر سروپلی رادھا کرشن کے بنگلہ پر لے گئے۔ انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایک مسلمان لڑکا ہندو یونیورسٹی میں ہندو تاریخ اور تہذیب پڑھنے آنا چاہتا ہے۔ آخر میں مجھ سے سوال کیا کہ میری رہائش کہاں ہوگی۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہوں گا۔ اس پر وہ بہت چونکے۔ وہ کہنے لگے یہاں آرٹس کے ہاسٹل میں ہندو رہتے ہیں اور میرا رہنا ممکن نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں تو ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ رہتا چلا آیا ہوں۔ ان کے گھروں میں بھی جاتا ہوں۔ ان کے ساتھ کھیلتا ہوں اور کھاتا ہوں اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ یہاں پر انڈے اور گوشت نہیں پکتا، اس لیے مجھے کھانے کی دقت ہوگی۔ میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو میں گوشت اور انڈا نہیں کھاؤں گا۔ میں یہاں پر ہندو تہذیب کو پوری طرح سیکھنے آ رہا ہوں اس لیے میں ان کے اندر رہنا چاہتا ہوں تاکہ مجھے ہر بات کا علم ہو جائے۔ رک کر میں نے پھر جواب دیا کہ کھانے کے متعلق میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ میں نے لکھ کر اپنی کاغذی

رضامندی دے دی اور یہ سن کر خوش ہو گیا کہ میں برلا ہاسٹل میں رہ سکتا ہوں۔

اس کے بعد میں بنارس سے سیدھے بسنہ آیا اور اپنے والدین کو بتایا کہ میں نے بنارس یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لے لیا ہے۔ والد صاحب بہت ناراض ہوئے اور انہیں پریشانی ہوئی کہ یہ کیا میں نے بنارس جانے کا شوشہ چھوڑ رکھا ہے۔ کچھ روز بعد ہماری بحث بند ہو گئی۔ والدہ میری خوش تھیں کہ میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری بہت ہمت بندھائی اور کہا کہ میں ضرور بنارس جاؤں۔ کچھ روز بعد میرے والد صاحب میرے پرانے ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر ساتھ لے گئے۔ اس امید سے کہ وہ مجھے بنارس جا کر ایم۔اے کرنے سے منع کریں گے کیونکہ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں ایل ایل بی پڑھوں گا۔ داشرتی ہوتا جو کہ برہمن تھے جب بنارس جانے کا نام سنا تو ان کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے علاقے سے کوئی بھی بنارس نہیں گیا ہے۔ اس لڑکے کو بنارس ضرور بھیجو یہ بہت ہونہار لڑکا ہے۔ وہ اس لیے زیادہ خوش تھے کہ بنارس ہندوؤں کی مقدس جگہ ہے انہیں کبھی وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ ان کے مجبور کرنے پر میرے والد صاحب راضی ہو گئے اور چند دنوں کے بعد میں بنارس کے لیے روانہ ہو گیا۔

بنارس شہر سے ہندو یونیورسٹی کافی دور تھی۔ سٹیشن سے سائیکل رکشہ پر بیٹھ کر روانہ ہوا اور سیدھا برلا ہاسٹل پہنچا۔ ڈاکٹر بی ایل آتریہ اس ہاسٹل کے چیف وارڈن تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں سائنس یا انجینئرنگ ہاسٹل میں داخلہ لے لوں۔ میری سمجھ میں بات نہ آئی۔ ایک رقعہ مجھے دیا اور میں دوسرے ہاسٹل میں پہنچا۔ وہاں بھی کسی بہانے داخلہ نہیں ملا پھر میں تیسرے ہاسٹل میں پہنچا وہاں طلبہ کا ہجوم بہت زیادہ تھا وہاں بھی مجھے داخلہ نہ ملا۔ میں واپس ڈاکٹر آتریہ جی کے پاس آیا اور ان سے عرض کی کہ وائس چانسلر صاحب نے میرا داخلہ اسی ہاسٹل میں کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں کھانے پینے کی دقت ہو گی۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ میں پہلے ہی لکھ کر دے چکا ہوں کہ یہاں پر میں گوشت اور انڈا نہیں کھاؤں گا صرف سبزی دال پر گزارہ کر لوں گا۔ وہ ہنسے اور آخیر مجھے داخلہ دے دیا۔ ہاسٹل کے ایک ونگ میں پروفیسر یار جنگ صاحب وارڈن تھے۔ ان کے پاس مجھے بھیج دیا۔ یار جنگ صاحب گجراتی مگ برہمن تھے جو کھانے پینے کا

اور چھوت چھات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دور رہنے کو کہا اور کہنے لگے میرا داخلہ کیسے یہاں ممکن ہو سکتا ہے یہاں تو صرف قدامت پسند ہندو رہتے ہیں اور یہ بھی چھوٹے چھوٹے میسوں (Messes) میں بند ہیں جو الگ الگ ذاتوں کے لڑکے اپنے قبضے میں رکھتے ہیں اور ان ہی لڑکوں کو اجازت ہوتی ہے کہ جو ان کی ذات کے ہوں۔

میں نے یہی رٹ لگائی کہ میں گوشت انڈہ نہیں کھاؤں گا۔ بہرحال مجھے ایک کمرہ مل گیا۔ ہاسٹل میں آگے پیچھے کمرے ہوتے تھے۔ درمیان میں ایک کھڑکی ہوتی تھی۔ میرے پیچھے والے کمرے میں ایک مرہٹا لڑکا رہتا تھا جو پونا کے قریب کسی گاؤں سے آیا تھا۔ میں نے اس سے مراٹھی میں بات کی اور اسی کے ساتھ اس کے میس میں چلا گیا۔ کوئی دقت نہ ہوئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد لڑکوں کو میرا پورا نام معلوم ہوا تو مجھے میس سے نکال دیا۔ اب میں ایک میس سے دوسرے میس جاتا لیکن کہیں اندر گھسنے کی اجازت نہیں ملتی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اب میں دوسرے ہاسٹل کے میس میں جاؤں گا۔ وہاں بھی جب میرے پورے نام کا پتہ چلتا تو مجھے میس سے نکال دیتے۔ آخر میں نے تنگ آ کر یونیورسٹی سے باہر شہر میں کھانا شروع کر دیا لیکن یہ روزانہ ممکن نہیں تھا۔ بڑی پریشانی ہوتی۔ شکایت بھی کسی عہدیدار سے نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں نے نزدیک رہنے والے لڑکے سے مدد مانگی۔ اس نے مشورہ دیا کہ میں اپنا گلاس اور پلیٹ خرید لوں تو وہ اپنے میس میں دوستوں کو مجھے کھانا دینے پر مجبور کرے گا۔ میں خوش ہو گیا سوچا چلو اس میس میں اجازت مل جائے گی اور میں اپنے برتن میں کھالوں گا اور اسے صاف کر لوں گا۔ جب میں اندر گیا دوسرے دن تو پھر بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ مجھے باہر رہنے کو کہا گیا۔ میں باہر ہی انتظار کرتا رہا۔ آخیر میں ایک میس کا نوکر باہر نکل کر دور سے ہی میرے برتن میں کھانا ڈال دیتا اور کہتا کہ جلدی بھاگ جاؤ کوئی دیکھ نہ لے۔ چلو کھانا تو مل گیا اور پیٹ بھی بھر گیا لیکن اس کا نفسیاتی اثر ساری عمر کے لیے مجھ پر پڑا۔ رات بھر مجھے نیند نہ آتی اور سوچتا رہتا کہ اتنا حقیر انسان ہوں میں۔ کیا مسلمان ہندو کی نظر میں اتنا گرا ہوا ہے۔ آخر مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے۔ اس سے پہلے تو کسی ہندو نے مجھ سے کبھی نفرت نہ کی۔ میں کئی ہندوؤں اور سکھوں کے گھر گیا اور مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ میں ان سے جدا ہوں۔ کبھی میں نے خیال بھی نہ کیا کہ میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو ہیں چونکہ

میں چند سال سے آزاد خیال ہو گیا تھا۔ نماز روزے کا پابند نہ تھا اس کے علاوہ اشتراکیت کا اثر مجھ پر چھایا ہوا تھا۔

میں اور انسانوں کی طرح اپنے آپ کو بھی صرف ایک انسان ہی سمجھتا تھا۔ اب کیا ہو گیا کیا میری انسانیت ہندو سے مختلف ہے۔ کیا ہندو علیحدہ قسم کے انسان ہیں؟ کیا مسلمان انسانیت کے دائرہ سے باہر ہے یا وہ علیحدہ انسان ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا اور اپنے حال پر روتا۔ کبھی یہاں کے استادوں کی باتیں یاد آتیں۔ کبھی میں اپنے والد صاحب کو یاد کرتا۔ کبھی رات رات بھر بیٹھ کر گزارتا۔ کبھی قبلہ رُخ منہ کر کے گڑگڑا کر روتا۔ کبھی ہاتھ باندھ کر روتا اور اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواہش مند ہوتا اور کہتا کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ سجدے میں پڑا پڑا سو جاتا لیکن شکایت میں کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ میرے استاد ڈاکٹر آلیکر مجھ سے میرا حال پوچھتے۔ میں ٹال کر کچھ جواب نہیں دیتا۔ یہی کہہ ڈالتا کہ میں ٹھیک ہوں۔ جب کبھی کھانے کے لیے اپنی پلیٹ لے کر جاتا ہاتھ کانپتا۔ ڈر لگا رہتا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ جب سب کھانا کھا چکے ہوتے تو اندھیرے میں چپکے سے جاتا۔ میس کے باہر کھڑا رہتا اور بچا کچا کھانا مجھے دیا جاتا۔ اسی میں ہی اطمینان کرتا تھا۔ آخر پیٹ بھرنا تھا۔

رات کو پھر وہی آنکھوں میں اندھیری۔ رونا' جاگنا اور سوچنا۔ میں نے قصد کیا کہ جو بھی مصیبت ہو میں یہیں پڑھوں گا۔ بھوکا رہوں گا لیکن اس یونیورسٹی سے بھاگوں گا نہیں۔ ایک رات اضطراب میں جاگا ہوا تھا کہ خون میں ایک لہر سی دوڑی۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور ایک دم خیال آیا کہ میں مسلمان ہوں۔ ہندوؤں سے جدا ہوں کم از کم سماجی نقطہ نظر سے جدا ہوں تو اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ میں اسے کیوں چھپاؤں۔ میں کسی سے کیوں ڈروں جو بھی مجھے پوچھے میں کیوں نہ کہوں کہ میں مسلمان ہوں اور انسان بھی ہوں۔ علم حاصل کرنے یہاں آیا ہوں۔ آپ جو بھی میرے ساتھ برتاؤ کریں انہیں برداشت کرنے کا مادّہ رکھتا ہوں۔ مجھے ہمت کرنی چاہیے اور لڑکوں کو بتانا چاہیے کہ مسلمان بھی انسان ہے اور انسان ہونے کے ناتے اُسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا' ہمت آئی اور خراٹے لے کر سو گیا۔ دیر سے اٹھا اور یونیورسٹی جانے میں بھی دیر ہو گئی۔ اب اس نئے خیال میں' نئی امنگ سے فخر کے ساتھ سر اٹھا کر چلتا اور لڑکوں سے

کہتا کہ میرے بھی آباؤاجداد کسی زمانے میں کشمیری برہمن تھے۔ پھر وہ مسلمان ہوئے۔ میں اسی مسلم گھرانے کا ایک فرد ہوں اور یہاں آپ لوگوں کی تہذیب اور تاریخ سیکھنے آیا ہوں۔ آپ مجھے پسند کریں یا نہ کریں، کھانا کھلائیں یا نہ کھلائیں، دوستی کریں یا نہ کریں مجھے یہیں رہنا ہے اور ثابت کرنا ہے کہ ایک مسلمان بھی ایسی حالت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ مصیبتوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ان خیالوں میں ڈوب جاتا اور خوش ہوتا اور دھیرے دھیرے دو چار لڑکوں سے دوستی قائم کرنا شروع کردی۔

اسی دوران ہندوستان میں گاندھی کی Quit India (ہندوستان چھوڑو) تحریک چلی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہل چل مچ گئی۔ انگریزوں کے خلاف طلبہ کھڑے ہوگئے۔ یونیورسٹی میں مکمل ہڑتال ہوگئی۔ سارے لڑکے شہر کی طرف جانے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ لڑکوں کے ساتھ نعرے لگاتا اور بڑے جوش میں آجاتا۔ جلسہ شام تک چلتا رہا چونکہ ہڑتال تھی اس لیے کوئی سواری نہیں چل رہی تھی۔ بارش شروع ہوگئی۔ لڑکوں کے ساتھ بھیگتے بھاگتے واپس آیا۔ راستے میں ہی سب کے ساتھ چنا چور اور پوڑی کھاتے آیا۔ رات کو ہاسٹل پیدل پہنچا، تھک کر چور ہوگیا تھا۔ انہیں بھیگے ہوئے کپڑوں میں سوگیا۔ صبح اُٹھا تو بدن گرم اور بخار سے کانپ رہا تھا۔ ساتھ والے لڑکے کو آواز دی وہ ہاسٹل چھوڑ کر گھر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جو ساتھی پہلے دن میرے ساتھ جلسے میں گئے تھے، میرے پاس آئے اور اطلاع دی کہ فوج کے آنے کی افواہ ہے۔ اب کیا کریں۔ دو تین دن کے بعد فوج آہی گئی۔ صبح صبح میرے کمرے کے سامنے ایک فوجی کھڑا تھا اور مجھے کمرے سے نکلنے کو کہہ رہا تھا۔ مجھے اس وقت بھی بخار تھا۔ اٹھنے کی طاقت نہ تھی لیکن اٹھنا پڑا۔ ہم سب کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور ہاسٹل خالی کرنے کا حکم ہوا۔

وہاں سواری کوئی نہیں تھی، بکس سر پر اٹھائے ایک ایک کرتے چلنے لگے۔ میں بھی لڑکھڑاتے آگے بڑھا۔ پھاٹک سے باہر نکلے تو ٹم ٹم کھڑے تھے۔ چار ساتھی مل کر ایک ٹم ٹم لیا اور کوچوان کو جلدی چلنے کے لیے کہا۔ کوچوان نے پوچھا کہاں جانا ہے۔ ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوچوان نے ہمیں ریشیشر گنج میں ایک برہمن دھرم شالے میں پہنچا دیا۔ وہاں کے لوگ یونیورسٹی کے طلبہ کی حالت سن چکے تھے۔ ہمیں خوش آمدید کہا اور بغیر نام پوچھے وہاں رہنے کی اجازت دے

دی۔انہوں نے یہی سمجھا کہ ہم سب برہمن ہیں مگر ہم چاروں میں سے کوئی بھی برہمن نہ تھا۔میں مسلمان تھا' ایک آسام کا آدمی داسی تھا۔تیسرا راجستھان کا رہنے والا تھا اور چوتھا کیرالا کا ہندو تھا۔جب ہمیں اس دھرم شالے کے قانون کا معلوم ہوا تو ہم سب نے اپنے آپ کو برہمن بتایا اور ہم سب وہاں مفت رہنے لگے۔میری بیماری کم نہ ہوئی۔بخار بڑھتا گیا۔نزدیک کے ڈاکٹر سے علاج شروع کیا لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔اب ہمارے پیسے بھی ختم ہو چکے تھے۔ایک روز ایک ڈاکیہ آیا اور زور سے میرا نام لے کر پکارا اور کہا کہ اس نام سے منی آرڈر آیا ہے۔پھر اوپر دیکھا کہ اس دھرم شالے میں مسلمان کیسے رہ سکتا ہے۔واپس جانے لگا' ہمیں پیسے کی سخت ضرورت تھی لیکن اس طرح پیسے لے بھی نہیں سکتے تھے۔آپس میں بات کر کے ایک لڑکے کو نیچے بھیجا اور اس نے جا کر ڈاکیہ سے کہا کہ اس نام کا ایک لڑکا ہے وہ یہاں رہتا نہیں ہے کبھی کبھی آتا ہے۔ہم اس سے اتھارٹی لیٹر لے لیں گے۔آپ دوسرے دن آئیں۔میں نے دوسرے دن ایک خط دیا اور پیسے مل گئے۔معلوم ہوا کہ منی آرڈر یونیورسٹی کے پتہ پر پہنچ گیا تھا اور ڈاکٹر آلیتکر نے جسے ہمارے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تھا یہاں بھجوا دیا تھا۔پیسے تو مل گئے لیکن اب ڈر لگ گیا کہ کہیں اس سے لوگوں کو ہماری اصلیت کا پتہ نہ چل جائے۔اسی دوران ہمارے راجستھانی ساتھی کو عشق کا بخار ہو گیا۔سامنے والی ایک لڑکی سے وہ آنکھ ملانے لگ گیا۔اس کا بھی علم لوگوں کو ہو گیا۔ہم سب ساتھیوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ایک روز صبح صبح ہم وہاں سے نکل چلے۔ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔گاڑیاں چلنی اب شروع ہو گئی تھیں۔میں بسنہ آ گیا اور کئی مہینے بیمار رہا۔

یونیورسٹی کھلنے پر دوبارہ میں واپس آ گیا۔اب میرے اور ساتھی بن چکے تھے۔ان سب کو معلوم تھا کہ میں مسلمان ہوں جس نے تحریک میں پہلے روز حصہ لیا تھا۔یہ سب ساتھی آزاد خیال کے تھے۔ان میں سے کوئی بھی برہمن نہ تھا۔انہیں ذات پات کا بھی کوئی خاص خیال نہ تھا۔ہم سب نے مل کر آفاقی میس کھولنے کا ارادہ کیا۔اس کی اجازت ہمیں مل گئی۔مجھے اس میس کے اندر جانے کی اجازت بھی مل گئی اور میں آرام سے کھانا کھانے لگا۔

اس میس میں بہت سے لڑکے آسام کے تھے۔کچھ کیرالا سے' کچھ راجستھان اور دو

بھائی بہار کے سہرام سے آئے تھے جنہیں ہم پیار سے بین اور للن کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ دونوں سیاسیات کے طالب علم تھے۔ بین سے میری بڑی یاری تھی۔ اس یونیورسٹی میں سال میں ایک دفعہ مختلف مضامین پر مقالہ لکھنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس سال کا موضوع تھا جینوں کے تیرتھنکر مہاویر جن کی زندگی اور اس کے عقائد اور اصول۔ بین کو میرے تاریخی علم کا بخوبی اور اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس نے مجھے مقالہ لکھنے کو کہا۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اگر میں لکھ بھی لوں تو کون مجھے انعام دے گا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ میں چپکے سے مقالہ لکھوں اور اسے بین کے نام سے پیش کیا جائے۔ یہی کیا گیا اور اس مقالہ کو پہلا انعام پانچ سو روپے کا ملا۔ بین روپے لے کر میرے پاس آیا اور وہ اس نے مجھے دے دیئے۔ ہم سارے دوست مل کر شہر گئے اور وہاں سینما دیکھا اور خوب گوشت پلاؤ کھائے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بین کے استاد جو سیاسیات کے شعبہ کے چیئرمین تھے وہ خود بھی جین تھے اس مقالہ سے بڑے متاثر ہوئے اور بین ان کے چہیتے شاگردوں میں گنے جانے لگے لیکن یہ راز زیادہ دیر تک نہ چھپ سکا۔ پہلے ہمارے ساتھیوں کو پتہ چلا اور بعد میں استاد کو۔ جب میرے اہل قلم ہونے کا بھید کھلا تو میرے ساتھیوں کا دائرہ اور بھی بڑھ گیا۔ میرے اپنے استاد ڈاکٹر آلٹیکر بھی بہت خوش ہوتے۔ اسی دوران میں نے اپنے آسامی دوستوں کے ساتھ آسامی زبان بولنا شروع کردی اور کیرالہ کے دوستوں کے ساتھ ملیالم کی طرف بھی رجحان بڑھا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کافی پیتا اور باہر کافی ہاؤس جاتا اور دریا گنگا کے کنارے سیر کرتا تھا۔

اکثر یونیورسٹی کے لڑکے شام کو پیدل گنگا کے کنارے سیر و تفریح کرتے۔ کبھی کبھی ہم کشتی میں بیٹھ کر گھاٹوں سے گزرتے دور دشاشومیوہ گھاٹ پہنچتے۔ یہ بہت مشہور گھاٹ تھا جہاں عورت مرد بچے نہایا کرتے اور یہیں سے پاک صاف ہو کر دیوناتھ کے مندر میں پوجا کرنے جاتے۔ گھاٹ پر بڑا ہجوم جمع ہوتا۔ اِدھر اُدھر لوگ مذہبی تقاریر کرتے، بھجن اور گیت گاتے، پھول اور مٹھائیاں بیچتے۔ کئی لوگ یہیں سے دریا پار ادگھاٹ جاتے۔ نزدیک ہی ایک اور گھاٹ تھا جہاں مردوں کو جلایا جاتا اور کبھی کبھی ادھ جلے لاشوں کو دریا میں بہتے دیکھا جاتا۔ بنارس میں گنگا کنارے ایسے بہت گھاٹ تھے جہاں پکی سیڑھیاں ہی تھیں۔ ان پر لوگ اترتے اور چڑھتے اور دریا میں نہا کر گنگا کے پانی کو ہاتھوں میں پھینکتے اور اپنے ماں باپ کے لیے دعا مانگتے۔ شام کے وقت یہاں

جوان لڑکیوں کی بھر مار ہوتی جو سر کے بال منڈوا کر رام کہانی سننے گھاٹ پر آتیں۔ بنارس میں چھوٹی چھوٹی بڑی گلیاں ہوتی تھیں۔ مندر خاص کی گلیوں میں پھول، کھلونے اور تانبے و کانسے کی بنی ہوئی مورتیاں بکتیں۔ باہر کے بازار میں بنارسی ریشم کے کپڑے بہت بکتے۔ دکاندار تو ہندو مارواڑی ہوتے لیکن لینے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ ہم اسی گھاٹ سے کچھ ہی دور ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے تھے اور اس کے بعد صلحی پان منہ میں چباتے فخر کے ساتھ گلیوں کی سیر کرتے تھے۔ ان گلیوں میں بیوہ لڑکیاں بیشمار ہوتیں۔ یہ وہ بنگالی لڑکیاں تھیں جن کی منگنی بچپن میں ہی ماں باپ کر دیتے تھے اور اگر ان کے ہونے والے خاوند کبھی فوت ہو جاتے تو ان لڑکیوں کی شادی پھر نہیں ہوتی تھی۔ یہ کنواری لڑکیاں بیوہ بن کر ساری عمر بنارس میں گزارتی تھیں کیونکہ ان کے ماں باپ انہیں یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ ان لڑکیوں کا کوئی سہارا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پوجا پاٹ میں مشغول ہوتیں اور ساری عمر اپنی قسمت پر آنسو بہا کر گزار دیتی تھیں۔ کچھ بوڑھی عورتیں انہیں مجبور کر کے عصمت فروشی کا کام لیتیں اور اس طرح اپنے کوٹھے ان معصوم لڑکیوں سے سجاتیں۔ یہ بے سہارا مجبور لڑکیاں اور کیا کر سکتی تھیں۔ انہیں بھی دنیا میں گزارہ کرنا تھا۔ یہ عورتیں اور لڑکیاں ہندو سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا تھا۔ میں جب تک وہاں موجود رہا میں نے اس کا کوئی حل نہیں دیکھا۔ کبھی یہ لڑکیاں اپنے آپ کو مندروں میں مورتیوں کے سامنے اپنی زندگی کو سونپ دیتیں لیکن ان کو وہاں بھی سکھ چین نصیب نہ ہوتی۔ ان مندروں کے کچھ پانڈے انہیں پھانس لیتے اور استعمال کرتے۔ ان پانڈوں کے نام سے مجھے اپنے کشمیری رشتہ دار بانڈوں کا یاد آیا جو شرینگر میں خانقاہ مورتی کی رکھوالی کرتے تھے۔ کبھی یہ بچاری عورتیں گنگا کی لہروں میں اپنے آپ کو ڈبونا چاہتیں لیکن اس کام سے لوگ انہیں بچا لیتے۔ صبح اور شام میں گھنٹوں اس گھاٹ پر کھڑے ہو کر یہ مناظر دیکھتا اور دل میں سوچتا کہ یہ بھی کیا اللہ کی شان ہے۔ ہزاروں انسان اپنے عقیدے کی خاطر گروہ در گروہ یہاں آتے اور گنگا کی لہروں میں اپنے آپ کو سمو کر اس دنیا سے اپنا بیڑا پار کرنا چاہتے۔ دنیاوی زندگی سے دور مورتیوں کے سامنے اپنے آپ کو اور اپنی چیزوں کی قربانی دیتے۔ گنگا کے پانی میں اپنے آپ کو پاک کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے پانی سے اپنے مرے ہوئے باپ دادوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ شاید یہ گنگا ان کی اپنی زندگی اور اپنے باپ دادوں کی زندگی کو

ایک لگا تار لڑی میں پرونے کا بہانہ بن جائے۔ اس دنیا کی مسلسل زندگی کو پانے کے لیے کیا کیا حرکتیں کرتے۔ ماں باپ اپنی بیوہ کنواری لڑکیوں کو چھوڑ جاتے اور ان کی یہی خواہش ہوتی کہ لڑکیاں اپنی زندگی کی کشتی گنگا میں بہا کر شاید جنت میں آگے بڑھ جائیں۔ یہ سارے خیالات مجھے بے چین کر دیتے اور میرے سامنے کاروانِ انسان کا سلسلہ لڑکھڑا جاتا۔ یہ نہ بکھرنے والا انسان کا گروہ تھا جو گنگا کی دھارا کی طرح آنکھوں کے سامنے بہتا چلا جا رہا تھا اور میں اکیلا کھڑا دیکھتا رہتا اور اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔ یہ تھا منظر بنارس کی شام کا جہاں روز ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں دریا پر پڑتیں اور پھر گم ہو جاتیں۔ یہ کہاں جاتیں تھیں مجھے نہیں معلوم ہو سکا اور نہ ہی یہ سمجھ آئی کہ انسان کس سمت جا رہا ہے۔ دریا میرے سامنے بہتا اور میں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ شاید میں بھی کسی دن اسی مسلسل زندگی کی لہر میں کھو جاؤں اور اس کا ایک حصہ بن جاؤں۔

بنارس شہر میں ہندو اور مسلمان اپنے اپنے محلوں میں رہتے تھے۔ وشوناتھ کا مندر یہاں کی بڑی مقدس جگہ تھی۔ ساتھ ہی ایک کنواں تھا جسے گیان واپی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے ذرا آگے اورنگزیب کے زمانے کی ایک پرانی مسجد تھی جس کے قبلہ کی دیوار کے باہر کی طرف ٹوٹی ہوئی مورتیوں کے پتھر لگے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس مسجد میں مندر کے پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود مندر اور مسجد دونوں ساتھ ساتھ چلتے اور میرے طالبعلمی کے زمانے تک یہاں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا۔ کافی دنوں کے بعد میرا ایک ہندو دوست اڑیسہ سے مجھے ملنے بنارس آیا اور میرے ساتھ ہی یونیورسٹی کے ہاٹل میں ٹھہرا۔ میں اسے شہر دکھانے لے گیا۔ کئی گھاٹوں کی سیر کرائی۔ پوری چھولے اور گول گپے کھلائے۔ پھر اس نے وشناتھ مندر جانے کی خواہش کی۔ میں تھوڑا سا ہچکچایا کہ میں مسلمان ہوں اور کس طرح اسے مندر کے اندر لے جا سکتا ہوں لیکن وہ نہ مانا اور مجھے وہاں چلنے پر مجبور کیا۔ ہم دونوں مندر کے اندر گئے۔ پھر ساتھ شیرنی کھائی اور پجاری نے ہمارے ماتھے پر ٹیکا لگا دیا۔

میرا علمی ورثہ بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے عام کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ کبھی میں نے بنیادی کتابوں کو نہیں پڑھا تھا۔ یہاں سکوں کی مدد سے تاریخ بنانا۔ سارے پرانے کتبوں کو پڑھنا۔ ان کے حروف کو پہچاننا اور ان کی بدلتی ہوئی شکل کو پرکھنا۔ ہندو سوسائٹی کے ہر پہلو کو

چاہے وہ سیاسیات ہو، اقتصادیات ہو، سماجیات ہو، رسم و رواج ہوں، عادات ہوں یا پھر مذہبی؛ انگریزی، ہندو و سنسکرت زبانوں میں پڑھنا شروع کیا۔ ان سب سے اخذ کر کے تاریخ بنانے کا طریقہ یہاں سکھایا جاتا تھا۔ میں دل و جان سے کوشش کرتا، اپنے استادوں کی محنت سے فائدہ اٹھاتا اور اپنے ہندو ہم جماعتوں کو دیکھتا۔ وہ بھی بہت محنت کرتے تھے۔ میں نے ان سے محنت کرنا سیکھا۔ اب طلبہ کی سیاست سے بالکل دور ہو گیا۔ اشتراکیت کا بھوت ختم ہو گیا۔ صرف میرا ایک ہی کام تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے میں لگاؤں اور امتحان میں سب سے اول آؤں۔ میری یادداشت بچپن سے بڑی تیز تھی۔ میرے استاد مجھ سے بہت خوش تھے اور شفقت کرتے تھے۔ ان میں فرقہ پرستی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر آلیتکر کے گھر کئی دفعہ گیا۔ وہ اور ان کی بیوی مجھے اپنے بیٹے کی مانند سمجھتے اور میری ہر مدد کرنے کو تیار تھے۔ یونیورسٹی کی لائبریری میں جب تک پڑھتا جب تک وہ بند نہ ہو۔ ایسی کوئی کتاب میں نے لائبریری میں نہیں چھوڑی جس کا ذرہ بھر بھی تعلق تاریخ سے ہوتا۔ آخر میں وہاں کی کتابوں کا اور ان کی جگہوں کا استاد ہو گیا۔ اگر لائبریرین صاحب کو کوئی کتاب نکالنی ہوتی تو فہرست دیکھنے کے بجائے مجھ سے پوچھا کرتے اور میں فوراً کتاب نکال کر دے دیا کرتا تھا۔ میں کبھی نوٹ نہیں بناتا تھا صرف یادداشت سے کام لیتا تھا۔ ڈاکٹر آلیتکر صاحب کے پاس پرانا رجسٹر ہوتا۔ اس میں سے حوالہ دیکھ کر بتاتے۔ امتحان سے پہلے مجھے اتنا یاد ہو گیا کہ کسی روز اگر ڈاکٹر آلیتکر کو حوالہ نہ ملے تو وہ مجھ سے پوچھا کرتے اور میں کتاب کا نام، اس کا صفحہ اور لائن تک بتا دیتا۔ اس یادداشت کی وجہ سے میں نے ان کی خوشنودی حاصل کر لی۔

اس کے باوجود ہماری رائے مختلف تھی۔ میں عالمی تاریخ کا طالبعلم تھا اور میرے لیے تمام انسان برابر تھے۔ میرے استاد ہندو تاریخ اور تہذیب کے ماہر تھے اور بنیادی شواہد کا انہیں بہت علم تھا لیکن میں مسلمان ہونے کے باعث ہمیشہ ان کے طنز کا نشانہ بنا ہوتا۔ جب کبھی ہندوستان پر مسلمانوں کے حملوں کا ذکر آتا تو وہ میری طرف انگلی کا اشارہ کر کے کہتے کہ دیکھو تمہارے لوگوں نے کیا تباہی مچائی تھی۔ کتنے لوگوں کو نقصان پہنچایا۔ کتنے منہ توڑے اور کتنے جنوں کو پھینکا۔ میرے پاس کوئی خاطر خواہ جواب نہیں تھا۔ میں چپ چاپ سنتا اور بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں نے ادب سے عرض کیا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں

بجا ہے لیکن عربوں کے زمانے سے لے کر امیر تیمور کے زمانے تک میرے بھی آباواجداد کشمیری برہمن تھے اس لیے ان حملہ آواروں کا تعلق نہ مجھ سے اور نہ میرے دادا پردادا سے تھا۔ میں ان وسط ایشیاء سے آنے والے حملہ آوروں کے متعلق سوچتا رہا۔ میں انہیں دنیا کی وسیع تاریخ کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب بات بہت بڑھنے لگی تو مدبرانہ آواز میں کہا کہ وسط ایشیاء سے حملہ اور ہمیشہ ہندوستان آتے رہے ہیں۔ سکندر اعظم بھی اسی راستہ یہاں آیا۔ جیسا آپ نے پڑھایا۔ آریا قوم بھی یہاں آ کر اس وقت کی قوموں پر ظلم ڈھاتی رہی۔ انہیں محکوم بنایا۔ ان کے قلعوں کو توڑا۔ ان کی تہذیب کو نیست ونابود کیا۔ اسی طرح ہونوں نے کیا۔ اسی طرح چنگیز خان نے کیا۔ ان میں سے تو کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔ ان لوگوں کے بعد بھی اسی طرح وسط ایشیاء سے حملہ آور آتے رہے ہیں۔ یہ حملہ آوروں کی ایک لمبی کڑی ہے۔ بعد کے لوگ مسلمان تھے لیکن دونوں کا ایک ہی تاریخی تسلسل تھا۔ اس میں اسلام کا کوئی دخل نہیں۔ میں آج مسلمان ضرور ہوں لیکن میں حملہ آوروں کے ساتھ نہیں آیا۔ میرے آباؤاجداد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بھی منگولوں کے ہاتھ بری طرح نقصان اٹھایا۔ یہ اور بات ہے کہ سلطان محمود غزنوی اور امیر تیمور کشمیر نہیں پہنچ سکے لیکن دونوں نے نہ مسلمان امیروں اور سلطانوں کو چھوڑا اور نہ ہندوؤں کو۔ وسط ایشیاء میں سلطان محمود کا آنا اور تغلق سے لڑنا جو مسلمان تھے۔ اسی طرح یہاں اس برصغیر میں پنجاب اور سرحد کے ہندوشاہی کو شکست دی اور ساتھ ساتھ ملتان اور سندھ میں عربوں کی حکومت ختم کی۔ امیر تیمور نے تو وسط ایشیاء میں کتنے مسلم گھرانوں کو تباہ کیا اور جب وہ ہندوستان آیا تو دہلی میں مسلم تغلق خاندان کی حکومت تھی۔ اس کو اپنے قبضے میں کیا اور اپنی ایک وسیع حکومت قائم کی۔ تاریخ کا ایک نیا ورق بدلا۔ امیر تیمور کے ہاتھوں کوئی مندر نہیں ٹوٹے البتہ ہم یہ ضرور پڑھتے ہیں کہ ہونوں نے تباہی مچائی اور پودھوں کو بڑا نقصان پہنچایا۔ اس کے باوجود وہ ہندوستان میں موجود رہے۔ مسلمان حملہ آوروں کے آنے سے بہت پہلے ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کہاں گئے وہ اور ان کا کیا حشر ہوا۔ اگر ہم جنوبی ہندوستان کی تاریخ دیکھیں تو وہاں عجیب سا حال پایا جاتا ہے۔ سلطان محمود نے سومناتھ کا مندر ضرور توڑا کیونکہ اسے اپنے ملک وسط ایشیاء میں لڑائی کرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ یہاں سونے اور جواہرات کے ڈھیر تھے۔ محمود کے حملے ایک ترکیب کے ساتھ

ہوتے۔ اس کے نتیجہ میں اس نے وادی سندھ کے سارے علاقوں کو ماسوائے کشمیر اور شمالی علاقہ جات کے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ باقی علاقوں سے صرف مال و دولت لوٹا۔ ان سارے حملوں کی وجہ وسط ایشیاء کی تاریخی اور جغرافیائی حالت ہے۔ یہ قومیں ہندوستان میں آتی رہی ہیں اور ہمارے آباؤاجداد ان کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ سب تاریخ کے واقعات ہیں ان سے سبق سیکھنا ہمارا کام ہے۔

اس وقت ان باتوں کو پوری طرح میں سمجھانے کے قابل نہیں تھا اور شاید جرأت بھی نہ تھی لیکن آخرکار میں مسلمان تھا اور میرا اپنا گناہ کہ نہ ہو بھیڑ اور بھیڑیا کی کہانی کے مانند میں ہی شکار ہوتا تھا۔ کبھی میں سوچتا کہ آخر یہ کیوں۔ تاریخ کے واقعات کو تو میں بدل نہیں سکتا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے سے بھی میں باز نہیں آسکتا۔ اسی یونیورسٹی کے تلخ تجربوں نے مجھے مسلمان ہونے کا احساس دلایا۔ اسے میں کیسے بھول سکتا تھا۔ میرا اور ہندوؤں کے ساتھ ایک بہت بڑا سماجی فرق تھا اور اب میرے کاندھے پر وسط ایشیاء سے آئے ہوئے سارے حملہ آوروں کا بوجھ رکھا جا رہا تھا۔

میں ہمیشہ زور دے کر کہتا کہ میرا مذہب اسلام امن پسند ہے۔ ہمیں لڑائی کرنا نہیں سکھاتا۔ وسط ایشیاء کے حملہ آور اسلام کے نام پر یہاں لڑنے نہیں آئے۔ یہ تو ترکوں کی آپس کی دوڑ تھی جو بعد میں منگولوں سے بھاگ کر یہاں آتے رہے اور سارے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ یہ تاریخی اصلیت ہونے کے باوجود ان حملہ آوروں کے وارث آج مسلمان ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو علیحدہ تو رکھا ہے۔ ان کی حرکتوں کو دیکھیں ہر حال کو دیکھیں۔ ان کے کھانے پینے اور پہناوے کو دیکھیں۔ ان کے آداب و اطوار کو دیکھیں۔ اب تمہیں دیکھو ہم سے تم کتنے جدا ہو۔ تمہارے اسلام سے ہمیں کوئی لڑائی نہیں۔ آخر اس ملک میں بہت سے مذاہب ہیں۔ اگر اسلام کا ایک اضافہ ہو جائے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تمہیں بتایا ہے کہ ہندوؤں کے کتنے مذہبی گروہ ہیں۔ سب کا نام بھی پہلے ہندو نہیں تھا۔ کسی سنسکرت کتاب میں تم کو ہندو لفظ نہیں ملے گا۔ یہ نام تو باہر کے لوگوں نے ڈال دیا۔ مسلمان مورخوں نے اسے عام کیا کیونکہ ہم میں اور مسلمان میں فرق تھا عملی باتوں کا۔ عملی حرکات میں تم ہم سے بہت دور ہو۔ اگر مذہب کا سبق

ہمیں لڑائی کرنا نہیں سکھاتا تو پھر یہ فرق کیوں۔

ان باتوں کو میں بڑے غور سے سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اپنے دماغ کے سہارے دنیا کی تاریخ پر نظر دوڑاتا اور سوچتا کہ ان میں سے بہت سی چیزیں تو عرب ممالک میں ہیں ہی نہیں پھران کا اسلام سے کیا تعلق۔ رہ رہ کر میری نظر وسط ایشیاء کی طرف جاتی اور پھر سوچتا کہ پنجاب میں، سرحد میں، سندھ اور کشمیر میں ہم سارے شلوار قمیض پہنتے ہیں۔ پیروں میں ہمارے اور قسم کے جوتے ہوتے ہیں۔ میں نے کتنے بادشاہوں کے سکوں پر یہ پوشاک دیکھی ہے۔ ان کے زیورات دیکھتے ہیں۔ وہ بھی شاہ کہلاتے تھے۔ ہمارے حکمران بھی شاہ یا بادشاہ کہلاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ پہناوا اور طور طریقہ اسلام سے بہت پہلے رائج ہوا۔ یہ ساری چیزیں یہاں وسط ایشیاء سے آئیں۔ کچھ اسلام سے پہلے اور کچھ اسلام کے بعد۔ انہیں کو ہم مسلمان اپنا سمجھتے ہیں۔ اس میں تو اسلام کا کوئی دخل نہیں۔

میں ان خیالات میں ڈوب جاتا اور پھر کہتا کہ ان سے فرق کیوں پیدا ہوا۔ یہ کیوں ہم مسلمانوں تک محدود رہ گیا۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میرے استاد مجھے بتاتے کہ یہی تو ہندو اور مسلمان کو جدا کرتا ہے دور سے ہم دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ ہندو جا رہا ہے اور وہ مسلمان آ رہا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے تہذیب کے تقاضے ہیں۔ اپنے اپنے رسم و رواج ہیں۔ اپنے اپنے طور طریقے ہیں۔ اپنے اپنے آداب ہیں۔ اپنا اپنا کھانا پینا ہے۔ یہ سارے عمل ہندو کو ہندو اور مسلمان کو مسلمان کی چھاپ لگاتا ہے۔ ان پر مذہب کا رنگ چھا جاتا ہے اور ہم مذہب کے نام پر لڑتے ہیں۔ اصل میں ہمارا اور تمہارا تہذیبی فرق ہے جس کی بنیاد تاریخ میں ہے۔ ہم اسے کیسے بھلا سکتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم اس کی مثالیں پاتے ہیں۔

اس پس منظر میں کبھی میں اپنے دوستوں کی طرف نگاہ دوڑاتا، کبھی بنارس کی گلیوں میں جا کر ہندوؤں کے الگ ڈھنگ کا مطالعہ کرتا اور کبھی اپنے کمرے میں بیٹھ کر کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ درحقیقت مسلمانوں کی تہذیب و اخلاق اور طرح کے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ میں نے اپنی زندگی میں تجربہ کیا وہ ایک دکھاوا ہے۔ جب کبھی میں مندر یا ہندوؤں کے گھر جاتا، اپنے گاؤں میں جانے کا موقع ملتا وہاں اب میں اس نقطہ نظر سے دیکھتا کہ

مجھ میں اور ہندوؤں میں کیا تہذیبی فرق ہے۔ اس یونیورسٹی میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ ساری باتیں یاد آ جاتیں اور میں خوب سمجھ جاتا کہ مجھے یہاں کھانا پہلے کیوں نہیں ملتا تھا۔ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جاتا تھا۔ یہ فرق کیا کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ کیا ہم ان کو دور پھینک کر ایک انسان کی راہ میں نہیں چل سکتے۔ کیا یہ ہمیشہ ہم کو جدا ہی رکھے گا۔ میری انسانیت کے خواب پر ضرب لگتی اور میں بے چین ہو کر پھر گنگا کنارے دوستوں کے ساتھ سیر کو نکل جاتا۔ دریا کے بہاؤ پر نظر پڑتی تو سوچتا کہ انسانیت کیا اس بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہہ رہی ہے۔ کیا ہم گنگا کے پانی کو روک سکتے ہیں۔ اگر ہم اسے نہیں روک سکتے تو انسانیت کی چال کو کیسے قابو کریں۔ میں دریا کے کنارے کھڑا رہتا اور تاریخ کا معمہ حل کرنے کی کوشش میں آنکھیں بند کیے گھنٹوں سوچتا رہتا۔

آخری سال میں نے انتھک محنت کی۔ کمرے سے میں بہت کم باہر نکلتا۔ یونیورسٹی جاتا اور کمرے میں بند ہو کر کتابوں میں گم رہتا۔ دوست ناراض ہوتے۔ میں ان سے کبھی بیماری کا بہانہ کرتا اور کبھی امتحان کی تیاری کا۔ خدا خدا کر کے امتحان کے دن آئے۔ میں نے پرچے دیئے۔ مجھے اپنے استادوں پر پورا بھروسہ تھا۔ خیالات الگ الگ ہونے کے باوجود مجھ پر ان کی بڑی کرم نوازی تھی۔ مجھ سے شفقت سے پیش آتے اور میرے ہر سوال کا جواب دیتے اور سمجھانے کی کوشش کرتے۔ کتابوں سے مدد کرتے اور ہمت افزائی فرماتے۔ میرے مسلمان ہونے کے باوجود میرے خلاف ان کا کوئی تعصب نہیں تھا۔ جب نتیجہ آیا تو میں ایم۔اے کے امتحان میں سب لڑکوں پر سبقت لے گیا۔ یونیورسٹی میں اپنا ریکارڈ قائم کیا۔ میرے استاد نے مجھے مبارکباد کا خط بسنہ بھیجا اور سر سروپلی رادھا کرشنن نے اپنے بنگلے پر بلوا کر پیٹھ تھپکی اور بتایا کہ اب بنارس ہندو یونیورسٹی کے جے کے فیلوشپ کا حقدار بن گیا ہوں۔ میں پہلا مسلمان لڑکا تھا جسے یہ اعزاز اس یونیورسٹی میں حاصل ہوا تھا۔ میرے والدین بھی بڑے خوش ہوئے۔ والد صاحب نے پوچھا کہ اب کیا کرو گے۔ میں نے جواب دیا کہ اور آگے پڑھوں گا۔ اس سے وہ خوش نہ ہوئے۔ میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب میں ان سے پیسے نہیں لوں گا۔ انہوں نے میری کافی مالی مدد کی۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنے پیروں پر خود کھڑا ہو سکتا تھا۔ مجھے اب اپنی جائیداد کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ میں اسے اب اپنے بڑے بھائی کے نام لکھنے کو تیار تھا۔

ان خوابوں میں مست جب یونیورسٹی کھلی میں واپس بنارس آ گیا۔ ڈاکٹر آلیتکر مجھے اپنے ساتھ پنڈت مدن موہن مالویہ جو اس یونیورسٹی کے بانی تھے اور اب بہت علیل تھے ان کے گھر لے گئے۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان سے میری بڑی تعریف کی۔ میں آگے بڑھا اور ان کی چارپائی پر ماتھا ٹیک دیا۔ اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر انہوں نے مجھے اشیرواد دیا اور آگے تحقیق کرنے کی ہمت افزائی کی۔ شکریہ ادا کر کے بڑے ادب سے میں خوش خوش واپس آیا۔ ان کے نورانی چہرے سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے وہ ہندو تہذیب کا جیتا جاگتا مجسمہ معلوم ہوئے اور یہ جھلک میں کبھی نہیں بھولا۔

کچھ روز کے بعد ڈاکٹر آلیتکر مجھے پھر سرسروپلی رادھا کرشنن کے بنگلے پر لے گئے۔ ان سے پوچھا کہ اب میرے ساتھ کیا کیا جائے۔ فیلوشپ لے کر میں نے ڈاکٹری کی ڈگری کے لیے داخلہ لے لیا۔ رادھا کرشنن نے جاننے کی کوشش کی کہ اس کے بعد میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں اپنے والد صاحب کے ساتھ جو کچھ باتیں ہوئی تھیں سب بتائیں اور اپنی خواہش ظاہر کی کہ میں اسی یونیورسٹی میں ملازمت اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت چونکے اور بولے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں تو صرف ایک ہی مسلمان پڑھانے والا ہے اور وہ بھی صرف عربی اور فارسی پڑھاتا ہے۔ میں کیسے یہاں دوسرا مضمون پڑھا سکتا ہوں اور وہ بھی ہندو تاریخ اور تہذیب۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس کے تو وہ قائل ہیں لیکن یہاں کے اس وقت کے عملی دستور کے مطابق یہ ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے مالویہ جی کے ہندو اصولوں کا حوال دیا اور کہا کہ مجھے یہاں نوکری نہیں مل سکتی۔ اگرچہ وہ خود مجھے دینا چاہتے تھے۔ وہ مالویہ جی کا بہت احترام کرتے تھے اور میری بھی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مجھے انہوں نے دلاسہ دیا اور کہا ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ملازمت کرنا چاہوں وہ میری ہر ممکن مدد کریں گے۔ لیکن میری یہی رٹ تھی کہ میں تو اسی یونیورسٹی میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہیں ادھوری رہ گئی اور میں واپس آ گیا۔ ڈاکٹر آلیتکر نے مجھے شمالی ہندوستان کے گئے زمانے کے بعد کی ہندو سوسائٹی پر کام کرنے کے لیے کہا اور شعبہ میں پڑھانے کے لیے کوئی حکم جاری نہیں کیا۔ میں خوش تو ہوا لیکن میری بڑی دل شکنی بھی ہوئی۔ میری خواہش تھی کہ میں یہاں پڑھاؤں اور تاریخ

کی ایک نئی فضا قائم کروں مگر یہ نہ ہو سکا۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ بلاوا آیا۔ ڈاکٹر آلیکر مجھے وائس چانسلر صاحب کے بنگلے پر لے گئے۔ رادھا کرشنن نے خوش ہو کر میرے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑایا اور مبارکباد دی کہ حیدرآباد دکن کے نواب نے میرے لیے ڈھائی سو روپیہ ماہوار کا ایک وظیفہ مقرر کیا ہے۔ مجھے خوشی تو ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ کیا مجھے اس یونیورسٹی کو چھوڑ کر کہیں حیدرآباد تو نہیں جانا پڑے گا۔ رادھا کرشنن نے میری بڑی مدد کی اور وہ چاہتے تھے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں اور باہر ملازمت کر لوں۔ یہ وظیفہ میرا ایک ذریعہ معاش بن جاتا کیونکہ اس کے ساتھ سر اکبر حیدری جو اس وقت حیدرآباد کے وزیر اعلیٰ تھے ان کا ایک خط بھی آیا تھا۔ میں نے وائس چانسلر کا شکریہ ادا کیا کیونکہ یہ سب کچھ انہیں کی مہربانیوں سے ہوا تھا اور کہا کہ میں نے تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرے اس اسرار پر وہ کچھ دیر چپ رہے اور پھر کہا کہ مجھے فیلوشپ کی رقم بھی ملے گی اور یہ وظیفہ بھی ملے گا۔ اس طرح میری ماہوار آمدنی دونوں ملا کر سوا تین سو روپیہ ہو گئی جو میرے بڑے استاد کی تنخواہ سے کچھ ہی کم تھی۔ اس زمانہ میں اس یونیورسٹی میں بڑے استاد کو پانچ سو روپیہ ملا کرتے تھے۔

میں نے اپنی تحقیق کا کام جاری رکھا۔ ایک روز مجھے ایک رقعہ ملا جو پروفیسر بنتا میکر (شعبہ تاریخ کے چیئرمین) کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا اور وہ بھی مجھے نہیں جانتے تھے۔ اس خط میں مجھے ایک مباحثہ میں حصہ لینے کو کہا گیا تھا جو اس یونیورسٹی کے صرف استادوں پر محدود تھا۔ عنوان تھا شمالی ہندوستان میں ہندو سلطنتوں کا زوال اور خاتمہ۔ اس میں میرے استاد آلیکر بھی حصہ لے رہے تھے۔ میں نے منظور تو کر لیا لیکن بہت ڈر لگا کہ اپنے استادوں کے سامنے کیا بول سکتا ہوں۔ بہر حال منظور کرنے کے بعد اب میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مقررہ دن سے ایک رات پیشتر میں بڑا کانپ رہا تھا۔ سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں لکھ لوں۔ میں نے رات کو لکھ لیا۔ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد کچھ منہ زبانی یاد ہو گیا۔

وقت سے پہلے میں کمرے میں آ گیا۔ ڈاکٹر آلیکر نے پروفیسر بنتا میکر سے متعارف کرایا اور میرا نام اے ایچ دانی بتایا۔ وہ مجھے مرہٹا سمجھنے لگے کیونکہ دانی کا نام مہاراشٹر میں برہمنوں کا

ہوتا ہے۔سب سے پہلے مجھے بلایا اور بولنے کو کہا۔ میں نے رات کو اپنی تقریر مقالہ کے طور پر لکھی تھی۔ نہ اس میں صدر صاحب اور نہ حاضرین مجلس کی طرف خطاب تھا۔ یادداشت تیز ہونے کی وجہ سے میں مقالہ پڑھنے کی طرح تقریر کر گیا۔ پہلے ڈر ڈر کر بولا اور بعد میں زور سے بولنے کی ہمت آ گئی۔ بنتا میکر صاحب نے بڑا پسند کیا۔ بڑی ہمت افزائی کی۔ میرے اپنے استاد کی تقریر پر مجھے ترجیح دی اور مباحثہ ختم ہونے کے بعد مجھے راشٹریہ سیوک سنگھ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ وہ خود اس ہندو سنگھ کے یہاں بانی تھے۔ میں مسکرایا اور چپ رہا۔شاید بعد میں انہیں معلوم ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کی بنا پر میں اس ادارہ کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال اس مباحثہ نے یونیورسٹی میں میری شہرت اور بھی بڑھا دی۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندو سلطنت کا زوال مسلمانوں کے آنے سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔اس کی خاص وجہ نہ صرف اندرونی سیاسی حالت تھی بلکہ اس تاریخی پس منظر سے ان کی وابستگی تھی جس کے تحت وسط ایشیاء کی قومیں یہاں ہمیشہ حملہ آور ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں نہ کوئی ایک مسلمان بادشاہ کا ہاتھ تھا اور نہ اسلام کا دخل۔ مسلمانوں نے فتح حاصل کی اور حکومت کی لیکن یہ سارے ایک شاہی خاندان کے لوگ نہیں تھے۔ جس طرح آریائی قومیں آپس میں لڑتی تھیں اور لڑتے لڑتے یہاں آئیں اور ہندوستان پر قابض ہوئیں اور پھیل گئیں۔ اسی طرح جن مسلمان حملہ آوروں نے یہاں فتح حاصل کی وہ ترک نسل کے تھے اور سب ایک قبیلے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یہ بھی آپس میں لڑتے تھے اور ایک کے بعد دوسرے قبیلہ آئے۔ پہلے آنے والے ترک قبیلوں کو ہرایا اور ہندو راجاؤں کو بھی شکست دی۔لڑائی ایک دن میں ختم نہیں ہوگئی۔ ہندو راجاؤں نے ایک روز کی شکست کے بعد ہمیشہ کے لیے ہتھیار نہیں ڈال دیئے۔ یہ لڑائی مسلسل چلتی رہی۔ سلطان محمود غزنوی نے سترہ بار حملے کیے۔اس کے بعد صرف پنجاب اور سندھ اپنے قبضے میں کر سکا اور ایک ہی شاہی خاندان کو پسپا کر سکا جو ہندو تھا اور اس خاندان کی بنیاد بھی ان ترکوں سے شروع ہوتی تھی جنہوں نے سلطان محمود کے آنے سے پیشتر یہاں اپنی سلطنت قائم کی تھی اور اب اس کی حفاظت کے لیے سلطان محمود سے جنگ کر رہے تھے۔ یہ وہ ترک شاہی لوگ تھے جو وسط ایشیاء میں اسلام پھیلنے سے قبل یہاں آ گئے تھے اور اسی طرح اور بہت سی قومیں وسط ایشیاء سے قبل از اسلام یہاں

آئیں اور اپنی چودھراہٹ قائم کی جنہیں تاریخ میں ہم راجپوت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ راجپوتوں نے اپنے آپ کو حکمران طبقے میں شامل کروایا اور اپنی جگہ اور مقام یہاں بنایا اور ہندو سماج انہیں قبول کرنے پر مجبور ہوا۔ ان کے لیے نئی روائتیں قائم کی گئیں اور انہیں اونچا درجہ دیا گیا۔ انہیں راجپوت راجاؤں نے شمالی ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی حکومتیں قائم کیں اور اس طرح یہ سارا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ ہندوستان کی مجموعی طاقت ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے ہاتھ آ گئی اور یہ طاقتیں اکٹھی نہ ہو کر نئے حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کرسکیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو جھک کر حملہ آوروں کے سامنے سپرد نہیں کیا۔ بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن حملہ آور اتنے اور ڈٹ گئے اور سخت تیاری اور متواتر حملہ کرتے رہے۔ ان کے پاس بھی اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان کے اپنے ملک میں دوسرے قبیلوں اور قوموں کا دباؤ تھا۔ وہ خود منگولوں سے جان بچا کر یہاں آ رہے تھے۔ خوارزم شاہ کی ہی مثال لے لیں اور ان کے ساتھ اور بھی بہت سے ترک قبائل تھے۔ یہ چنگیز خان کا مقابلہ نہ کرسکے اور بھاگ کر یہاں آئے۔ یہاں بھی نہ رہ سکے اور آخر ان کا خاتمہ ہوا اور منگولوں نے اپنی حکومت بیجنگ سے لے کر ہنگری تک پھیلائی۔ دہلی سلطنت کا قیام اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جہاں البری ترک، خلجی، تغلق وغیرہ حکومت کرتے رہے ہیں۔ بعد میں امیر تیمور نے اپنا سکہ جمایا اور سوائے چین کے پورے ایشیاء میں اپنی سلطنت قائم کی۔ دہلی میں بھی اپنے پسند کے خاندان کو بٹھایا۔ اس کے بعد لودھی، میسوری خاندان کے افغانوں نے حکومت کی۔ وہ باہر سے حملہ آور نہیں ہوئے بلکہ وہ پہلے یہاں آ چکے تھے اور یہاں کی بدلتی ہوئی سیاست سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو مستحکم کیا اور بلند پائے تک پہنچایا اور شمالی ہندوستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہ تاریخ کا ایک نیا ورق تھا۔ نیا دور تھا جس میں ایک نیا نظام قائم ہوا جہاں ترک اور افغان بادشاہوں نے اپنا وسط ایشیاء کا طرز طریقہ یہاں شروع کیا۔ اس زمانے میں یہ سب مسلمان ہو چکے تھے۔ اس سے پیشتر آنے والے حملہ آور غیر مسلم تھے۔ ہندوؤں نے انہیں مجبوراً قبول کیا۔ مسلمان حملہ آوروں نے اپنی ایک نئی تہذیب اور ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جس کے باعث سارے ہندوستان کی شکل اسی طرح تبدیل ہوئی جس طرح راجپوتوں کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس بدلے ہوئے درمیانی دور کا ذکر

یہاں نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ ضرور بتاتا چلوں کہ ہندوؤں نے خود اس طرز تعمیر کو مسلمانوں سے وابستہ کیا ہے اور وہی وسط ایشیاء کی تہذیب ہندوستانی مسلمانوں کی وارث ہے۔ اس تہذیب کو نہ تو سمجھا گیا اور نہ ہی اس کا جائزہ لیا گیا۔ اس سے صرف دشمنی مول لی اور اس کا نشانہ ہندوستانی مسلمان کو بنایا اور ہندو اپنے آپ کو ان کے ہاتھوں شکست خوردہ سمجھنے لگے اور یہی سمجھتے رہے کہ ان کے زوال کا سبب یہ مسلمان ہیں۔ اس نئے دور کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔ راجپوتوں کا ابھرنا اسی کی ایک کڑی ہے۔ پاٹلی پترا سے قنوج اور پھر وہاں سے دہلی یا آگرہ دارالخلافہ کا تبدیل ہونا اس سلسلہ کی نشانی ہے۔ یہ تاریخ کا مسلسل بہاؤ ہے۔ اسی کو استوار کرنے کے لیے منگولوں کے بعد وسط ایشیاء میں امیر تیمور کھڑا ہوا اور اس نے اس نئے دور کی بنیاد ڈالی جس کی بنیاد پر ساری تیموری تہذیب کھڑی ہوئی۔ مغل بادشاہوں نے اسی تہذیب کو افغانستان سے لے کر سارے ہندوستان میں پھیلایا۔ ہم سب امیر تیمور کے حملہ کو یاد کرتے ہیں اور اسے مورد الزام ٹھہرا کر اسے کوستے ہیں لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس نے کس نظام کو جنم دیا۔ کس تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اس کے نتائج ہندوستان میں کیا ہوئے۔ کئی مغل بادشاہوں نے ہندوستان کو ایک نئی وحدت میں پرویا اور یہاں کی خستہ تہذیب کو ایک نئی شکل دی جس نظام میں مسلمان ضرور اوپر آگئے جیسے پہلے راجپوت آگئے تھے لیکن ہندوستان نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا اور ہم سب اسی نظام کے مرہونِ منت ہیں کہ ہم نے قدیم زمانے کو خیر باد کہہ کر نئے دور کی طرف قدم رکھا۔ اس تاریخ کے تسلسل میں نہ ہندو کے زوال کا سوال آتا ہے اور نہ مسلمان کی فتح کا۔ عربوں نے جو اسلامی طاقت پھیلائی وہ تو سندھ اور ملتان و سرحد تک محدود رہی لیکن ہماری اپنی تاریخ کا سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ اس انسانی تاریخ کو سمجھنا ہمارا فرض ہے اور ہم کیسے کہیں کہ اس تاریخ میں ہندو اور مسلمان کا کتنا حصہ ہے۔ تاریخ کا کوئی بھی زمانہ منجمد نہیں ہوسکتا۔ اس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ چاہے ہم اسے قبول کریں نہ کریں۔ دنیا کو آگے بڑھنا ہے وہ بڑھے گی۔ اگر ہم اس بڑھتے ہوئے واقعات سے کنارہ کشی اختیار کریں تو ہماری حالت اسی آدم نو اسی کی طرح ہو جائے گی جو اس دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ گئی ہے۔ آج دنیا کی تاریخ کے پس منظر نے خود کو پرکھنا، اس کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈالنا ضروری ہے اور پھر دیکھیں کہ کیا ہندو زوال پذیر ہمیشہ رہا یا اس میں آگے بڑھنے کی قوت ہے۔ اگر ہم اس

سے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں تو ہمیں آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

تہذیبی نقطہ نظر سے تیموری زمانہ ایشیاء کا دور زرّیں کہلانے کا مستحق ہے جو لوگ صرف امیر تیمور کے حملوں کا ذکر کرتے ہیں اور وسط ایشیاء کے شاہی خاندانوں کی پستی کا بیان کرتے ہیں۔ انہیں اس کا کوئی علم نہیں ہوتا کہ امیر تیمور نے کوئی نظام دنیا میں رائج کیا۔ اس کی حکومت کے نتیجہ میں مغلوں نے ہندوستان میں ایک نیا ڈھنگ شروع کیا جسے بہت سے مورخ دوپہر اور شام کی دھوپ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس زمانے کے بعد ہی ایران میں عباسیوں کا دور دورہ ہوتا ہے اور ایران اپنی تہذیب کے ارتقاء کی انتہا پر پہنچتا ہے۔ چین میں بیگ خاندان برسر اقتدار آتے ہیں اور پہلی دفعہ پورے چین کو چینی تہذیب کی اصلی شکل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وسط ایشیاء میں وادی زرفشاں، سمرقند اور بخارا پر عبانیوں اور پھر منگی خاندان کی حکومت کا ستارا چمکتا ہے اور زرفشاں جسے ہم زریں لفظ سے تشبیہ دے سکتے ہیں عروج میں آتا ہے۔ اس وقت اشمالیا سلطنت کی جڑیں آدھی یورپ میں دینوراتر ہوجاتی ہیں اس لیے زمانے کا آغاز تیمور سے ہی کیا۔ فارسی اور ترکی ادب کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ دینوری اور زریں قلمی کو چار چاند لگ گئے۔ فن تعمیر کی شان آج بھی تیمور کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسلام دوستی، شہروں اور درویشوں کی سرپرستی اور ان کی درگاہوں کی تعمیر اور ان کا خرچ اور بہت سے مدرسوں کے بنانے میں جتنا کام اس نے کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ نئے نئے شہر بسانا اور نئی نئی نہریں کھودنا اور اس کے ساتھ زرعی اور نہری ترقی دینا اس کا شیوہ تھا۔ بدقسمتی اس بات کی ہے کہ اس زمانہ کی تہذیب کا مطالعہ ہم نے کبھی نہیں کیا۔ صرف تیمور کی فتوحات اور پرانے شہروں کی بربادی کے متعلق ہی پڑھتے چلے آئے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہر زمانہ کو ہم اس کی اپنی اصلیت کے پس منظر میں سمجھیں اور لوگوں کو بتائیں کہ انسانی تہذیب کو کس شکل میں اس نے بڑھانے کی کوشش کی۔ ہمارے پاکستان کی اپنی تہذیب بھی اسی کی آئینہ دار ہے اور ہمارا اپنا ورثہ اسی کی ایک شاخ ہے۔ ہمارے بہت سے لوگوں کے آباؤاجداد اسی وسط ایشیاء کے علاقے سے آئے ہیں۔ ہم اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنا ہے تو انہیں علاقوں میں جا کر تحقیق کرنی ہوگی۔ ہماری اپنی تہذیب کی جڑیں وہیں سے پھوٹی ہیں۔ ہم پاک و ہند برصغیر میں رہتے ضرور ہیں لیکن جیسا میں نے پہلے بیان کیا ہم

مسلمانوں اور ہندوؤں میں فرق یہ ہے کہ ان کی جڑ ہندوستان میں ہے اور گو کہ ان کا اثر ہم پر ہے لیکن ہمارا رشتہ وسط ایشیاء کی تہذیب کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ اسی لیے آج بھی ہندو ہمیں جدا سمجھتا ہے اور ہمیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو بھی غیر ہندوستانی حملہ آور یہاں آتے رہے ہیں قدامت پسند ہندوان کے لیے ملیچھ کا لفظ حقارت کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ یہی لفظ وہ ہم مسلمانوں کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ آج بہت سے عالموں کا خیال ہے کہ یہ لفظ (Bablonian) کی پرانی زبان کے ملوحہ سے نکلا ہے اور ملوحہ شاید وادی سندھ کی تہذیب کا مسکن تھا۔ اس طرح آج کے پاکستان کا سب سے قدیمی نام ملوحہ تھا۔ اس طرح ہم پاکستانی تہذیب ملیچھ کے بچے وارث ہیں۔ جب میں طالبعلم تھا اس لفظ سے مجھے بڑی چڑ تھی لیکن آج اس لفظ کو قبول کرنے میں مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس کے آثار ابھی بھی ہماری زندگی پر حاوی ہیں۔ شاید اسی تہذیب کو کم از کم ان کے بعد کے دارثوں کو عربوں نے شکست دے کر نیست و نابود کیا۔

یہ شواہد ہمیں تاریخ میں نہیں ملتے۔ اس کے لیے ہمیں آثاریہ کے دائرے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ جب میں 1944ء میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد تحقیق کر رہا تھا تو ایک دن ڈاکٹر آلیتکر نے بلا کر کہا کہ اس یونیورسٹی میں مارٹی مر وہیلر آنے والے ہیں وہ اسی سال ہندوستان میں آثاریات کے ڈائریکٹر جنرل تعینات ہوئے ہیں اور وہ سیدھے شمالی افریقہ میں لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد دہلی آئے ہیں۔ مجھے کہا گیا کہ میں ان سے ملنے جاؤں۔ بڑے تپاک سے میں ان سے ملا اور ملاقات کے بعد انہوں نے کہا کہ میں ٹیکسلا کے ٹریننگ سکول میں شریک ہو جاؤں۔ میں ڈاکٹر آلیتکر کے پاس واپس آیا اور سب باتیں انہیں سنائیں اور ساتھ ہی کہا کہ میں تو یہاں کا فیلو ہوں۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے کہا گیا کہ میں اس یونیورسٹی کا نمائندہ بن کر ٹیکسلا جاؤں گا۔ مجھے اطمینان ہوا اور چند روز کے بعد ٹیکسلا شہر کے پرانے کھنڈروں میں قدم رکھا۔ میں قدیمی جگہوں کو مثلاً سارناتھ، نالیندا، بودھ گیا، راجگیر وغیرہ ڈاکٹر آلیتکر کے ہمراہ دیکھ چکا تھا لیکن وہ ایک قسم کی باقیات کی سیر تھی۔ یونیورسٹی میں کچھ مضامین جیسے سکہ شناسی، کتبے شناسی میں نے پڑھے تھے جن کا تعلق آثاریات سے تھا لیکن اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آثار شناسی کیا ہوتی ہے اور خاص یہ معلوم نہ تھا کہ شہر کو کھود کر نکالنے کا بھی کوئی

طریقہ ہوتا ہے۔ پہلے مہینہ میں ہم تھوڑے لڑکے تھے بغیر کسی عجلت کے ایک دم ہمیں کھدائی کے کام میں لگا دیا گیا۔ ہمارے ساتھ مزدور تھے اور ہمیں ان کے کام کی نگرانی کرنی تھی۔ وہیلر اور ان کے ایک اور ساتھی سٹر کیسی جن کا تعلق آسٹریلیا سے تھا ہمارے پاس آئے اور سکھانے کی کوشش کی کہ آثاریاتی تہہ (Archeological Layer) کیا ہوتی ہے۔ کھدائی کس طرح تہہ بہ تہہ کی جاتی ہے۔ ارضی قدرتی تہہ کے مانند انسانی تاریخ کی بھی تہیں ہوتی ہیں۔ ان کی اچھی طرح کیسے پہچان کی جاتی ہے۔ کس طرح ہر آثاریاتی تہہ میں دبی ہوئی چیزوں کو روزنامچہ میں درج کیا جاتا ہے اور جس چوکور مربع میں ہم کام کرتے ہیں وہاں ہر چیز کی پیائش کیسے کی جاتی ہے۔ زمین کی سطح پر کیسے صفر کی جگہ پہلے متعین کی جاتی ہے اور اس سے کس طرح نیچے ناپا جاتا ہے۔ اس قسم کی کھدائی کو عمودی کھدائی (Verticaldy) کہتے ہیں۔ اس میں آثاریاتی تہوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے اور ایک تہہ میں ملی ساری چیزوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے اور یہ سب مل کر ایک ثقافتی سلسلہ بناتے ہیں۔ انہیں سے پھر ہم ایک زمانے کی باقیاتی ثقافت مرتب کرتے ہیں۔ یہ کھدائی کا طریقہ بالکل نیا ہے۔ جسے وہیلر صاحب نے دنیا میں رائج کیا۔ اس کے ذریعہ زمانہ وقت تاریخ وار بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس سطحی کھدائی کا طریقہ ہے جسے سر جان مارشل نے اسی شہر میں اپنایا تھا۔ اس طریقہ کے مطابق کھدائی فٹ در فٹ کی جاتی ہے اور سطحی صفر سے اسی قدر ناپی جاتی ہے۔ آثاریاتی تہہ کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اگر کوئی دیوار مل جائے تو دیوار کیساتھ ساتھ کھدائی کی جاتی ہے۔ ان ساری دیواروں سے کمرے، پھر دکان بعد از پورا شہر ابھرتا ہے لیکن اس سے آثاریات کے تمام شواہد مٹ جاتے ہیں۔ یوں تہذیب تو سامنے آجاتی ہے لیکن ان کا تاریخی سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہم تاریخ وار واقعات کو مرتب کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ ہندوستان میں پہلی دفعہ رائج کیا گیا۔ وہیلر صاحب کے آنے سے پہلے جو کھدائی کا طریقہ تھا اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اب وہیلر کا زمانہ شروع ہوا۔

ایک ماہ کے بعد تقریباً سارے ہندوستان سے مزید ساٹھ امیدوار اور بھی علوم آثاریہ سیکھنے کے لیے آگئے۔ میں بھیر ٹیلے پر کھدائی کر رہا تھا۔ ہمیں کھدائی کے علاوہ فوٹوگرافی، نقشہ گری، خطوط کشی، جریب کاری اور فن محتسب وغیرہ بھی سکھایا جاتا تھا۔ روز رات کو وہی سبق بھی دیا جاتا

تھا۔ ہفتہ میں ایک دن وہیلر صاحب سب لڑکوں کو لے کر ٹیکسلا کے مختلف مقامات پر جاتے اور ان پر تقاریر کرتے۔ اسی طرح ٹیکسلا کے باقیات پر ایک اچھا معلوماتی سبق دیا گیا۔ اس ٹیکسلا سکول سے نہ صرف ہم نے کھدائی کا نیا طریقہ سیکھا بلکہ اس قدیم شہر کی پرانی تاریخ اور تہذیب کو بھی ذہن نشین کیا۔ بدقسمتی سے وہیلر صاحب کا دوسرا مقصد حل نہیں ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم یہاں سے آریاؤں کا بھی نشان ڈھونڈ نکالیں۔ اس میں انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہیلر صاحب نے خود اس کھدائی کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

اس عملی تربیت نے ہم سب کو بڑا فائدہ پہنچایا اور پہلی دفعہ میں نے آثاریات سے واقفیت حاصل کی۔ مجھے اس کے بعد معلوم ہوا کہ آثاریات کا قدیم تاریخ سے کتنا تعلق ہے۔ اس سے بھی زیادہ وہاں جو لڑکوں کا مجمع اکٹھا ہوا تھا ان سب کو ایک دوسرے سے شناسائی حاصل ہوئی۔ جب بھی وقت ملتا ہم سب اکٹھے ہو جاتے اور تبادلہ علم ہوتا۔ اس موقع پر اکثر میں سنسکرت کی نظمیں سنایا کرتا اور احباب خوش ہو کر سنتے۔ ہمارا ایک ہی میس تھا جس کا منیجر منگلائے تھا۔ اسی میس میں ہم سب کھاتے اور منگلائے کا مذاق اڑاتے۔ مزدوروں کے نگران خاں صاحب صدیقی کرتے تھے جو بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے سر جان مارشل کے زمانہ میں یہاں کھدائی کی تھی اور اب ٹیکسلا میں ہی سکونت پذیر تھے۔

ٹیکسلا تہذیبوں کا گہوارہ تھا۔ یہاں قدیم شہروں کے آثار اور بودھوں کے خانقاہوں کے باقیات بے شمار تھے۔ عجائب (یا آثار) خانہ بڑی اچھی طرح سے منظم تھا جسے سر جان مارشل نے خود ترتیب دیا تھا۔ اس کے نگران مسٹر گپتا تھے۔ اس کا تعلق بنگال سے تھا۔ ہمارے کیمپ کے نگران افسر مسٹر املانند گھوش تھے۔ فن محتسبی ہمیں مکرجی سکھاتے تھے۔ بنگالیوں کی ایک چھوٹی ٹولی وہاں بن گئی تھی۔ وہ سب آپس میں بنگالی زبان میں بات کرتے تھے۔ اس وقت میں بنگالی نہیں سمجھتا تھا اس لیے بہت سی باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مجھے بڑا برا محسوس ہوتا تھا اور میں نے عہد کیا کہ بنگالی سیکھنا چاہیے۔ شروعات تو میں نے کر دی لیکن زیادہ موقع یہاں نہیں ملتا تھا۔ میری یہی خواہش تھی کہ ہم زیادہ سے زیادہ ٹیکسلا کے متعلق معلومات حاصل کریں لیکن ہمارا علم تشنہ رہ گیا۔ نہ شہر کے آغاز کا علم ہو سکا اور نہ ہی شہر کی تاریخ و نشوونما کا صحیح طریقہ سے اندازہ ہو سکا۔ میں اس کا

قائل نہ تھا کہ ہوتوں نے اسے تباہ کیا ہے۔صرف ایک ہی بات سمجھ آتی تھی کہ یہاں مشرق اور مغرب دونوں کی تہذیبیں آ کر جڑی ہیں اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا ہے جسے ہم گندھارا تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تربیتی سلسلہ ختم ہونے کے بعد میں واپس بنارس یونیورسٹی چلا گیا اور یہ عجیب سا قسمت کا کرشمہ ہے کہ کچھ ماہ کے اندر ہی میں محکمہ آثاریات کے دفتر میں ایک افسر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔اس کا ذکر آگے باب میں کیا جائے گا۔آثاریات کا کام میں کرتا رہا پھر برصغیر آزاد ہوا اور میں پاکستان آ گیا۔میرا تبادلہ مشرقی پاکستان کے شہر راجشاہی میں ہو گیا۔اس کا خلاصہ آگے الگ باب میں کیا جائے گا۔ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک رازدار خط مجھے ملا۔اس پر خواجہ ظہر الدین صاحب کے دستخط تھے۔یہ اس وقت آثار کے صدر دفتر کراچی میں سپرنٹنڈ تھے۔ان کو میں نہیں جانتا تھا۔یہ خود کٹر قسم کے کشمیری تھے اور کہیں سے سن رکھا تھا کہ میں بھی کشمیری ہوں۔اس خط میں مجھے انہوں نے ایک دفتری فائل کے آفس نوٹ کی نقل بھیجی تھی جس میں تقسیم برصغیر سے پہلے دو آثار شناس کو لندن بھیج کر اعلیٰ تربیت دینی تھی۔ان میں ایک بھارت کے بی بی لال تھے اور دوسرا پاکستان کا اس میں میرا نام تھا۔انہوں نے مجھے لندن جانے کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی تھی اور یہ واضح کیا کہ جلد ہی ڈائریکٹر سے خط بھجوا دیا جائے گا۔میں بڑا خوش ہوا۔انتظار کرتا رہا لیکن کوئی خط نہیں ملا۔معلوم ہوا کہ کچھ روز کے بعد خواجہ ظہر الدین کا تبادلہ ہو گیا اور اس اعلیٰ تعلیم کی تجویز کو سرد خانہ میں ڈال دیا۔بعد میں جب مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو خواجہ صاحب نے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور سارا قصہ سنایا کہ کس طرح کراچی دفتر میں سازش ہوئی اور چونکہ لندن جانے کے لیے میرا نام تھا اس لیے تجویز کو منسوخ کر دیا گیا۔میں نے خواجہ صاحب کو اپنے خاندان کا سارا حال سنایا۔میں نے ان سے کہا کہ راجشاہی کراچی سے اتنا دور ہے۔میری بات کو کراچی کے دفتر میں کون سنے گا۔میں نے اس بات پر زور دیا کہ کوئی بات نہیں اللہ مالک ہے اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس قسم کی ناانصافی کی شکایت میں نے مشرقی پاکستان میں بھی اور بنگالیوں کی زبانی سنی ہے اور یہی بنیاد بن سکتی ہے دونوں پاکستان کے درمیان دشمنی کی۔اس کا خلاصہ اگلے باب میں کیا ہے۔

بہت سالوں سے اردو پڑھنا میں نے بہت ہی کم کر دیا تھا اور فارسی بھی قریب قریب بھول گیا تھا۔ راجشاہی آ کر میں نے اردو کی کتابیں پھر سے شروع کیں اور بہت شاعروں کے کلیات، تاریخی کتابیں اور خاص کر مولانا حالی مرحوم کا ''شاہنامہ اسلام'' بڑی محنت کے ساتھ پڑھنے لگا۔ اس سے اسلام کی طرف رغبت بڑھی اور میں نے دوبارہ نماز شروع کر دی۔ یہیں میں نے بنگالی لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھا۔ سوچتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دفتر کے ممبران میرے خلاف شکایت کریں کہ یہ ہندو یونیورسٹی کا طالب علم اور سنسکرت پڑھا ہوا آخر پاکستان کیوں آیا۔ ہو نہ ہو یہ کوئی بھارتی جاسوس ہے۔ کراچی والوں کو میرے خاندان کی پریشانیوں کا کیا علم۔ پنجاب میں مہاجروں کی جو حالت ہوئی اس کا تھوڑا سا بیان آگے دیا گیا ہے۔ بہر حال میں اتنا مجبور ہوا کہ سرکاری محکمہ سے بھی استعفیٰ دینا پڑا اور آخر کار ڈھاکہ یونیورسٹی میں ملازمت کرنا پڑی۔ جب میں نے شعبۂ تاریخ میں پڑھانا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے استادوں نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ہے اور میں صرف ایم۔اے تھا۔ میں نے سوچا اعلیٰ ڈگری مجھے بھی حاصل کرنی چاہیے۔ یونیورسٹی میں میرے بہت سے رفیق (Nuffield) نفلیڈ فیلوشپ کے لیے درخواستیں دے رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھیوں نے درخواست بھیجنے کو کہا۔ اپنی قابلیت واہلیت کی بنا پر میں نے بھی درخواست دے دی۔ اس کے کچھ ہی روز بعد میرے پرانے دوست ایس اے نقوی صاحب جو کراچی دفتر میں کام کرتے تھے۔ ڈھاکہ آگئے اور میرے پاس ہی قیام کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں نفلیڈ فیلوشپ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہے۔ ہمیں تعجب ہوا کہ یہاں تو ابھی تک ہمیں ملاقات کے لیے بھی نہیں بلایا گیا اور یہ نامزدگی کیسے ہو سکتی ہے۔ میں نے نقوی صاحب سے کچھ مزید معلومات حاصل نہیں کیں اور انتظار کرتا رہا۔ کچھ روز کے بعد کمیشن سے بلاوے کی تاریخ ملی۔ اس میں بہت سے لوگ چنے گئے۔ ان میں سے ایک شریف صاحب تھے جو محکمہ تعلیم کے اونچے افسر تھے۔ جیسے ہی میں اندر جا کر بیٹھا شریف صاحب نے کہا کہ جب میں نے آثاریات کو چھوڑ دیا ہے تو پھر کیوں اس فیلوشپ میں آثاریات پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ نقوی صاحب نے جو بات کی تھی اس میں سچائی ہے۔ میں نے تپاک سے جواب دیا کہ میں نے آپ کا محکمہ چھوڑا ہے آثاریات کو خیرباد نہیں کہا۔ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سلام کیا اور باہر نکل آیا۔ جب

میں نے یہ قصہ اپنی یونیورسٹی کے دیگر ساتھیوں کو سنایا تو وہ بھی حیران ہوئے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس سال نہیں چنا گیا۔ یونیورسٹی میں جب ہم باتیں کرتے تو بنگالی پروفیسروں کی بڑی دل شکنی ہوتی اور وہ کہتے کہ دیکھو یہ مغربی پاکستان والوں کی زیادتی ہے۔

اس کے بعد میں نے اور بہت سی درخواستیں دے رکھی تھیں۔ 1951ء میں مجھے اکٹھے تین فیلوشپ ملے۔ ایک یو ایس ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا، دوسرا یونیسکو کا اور تیسرا فرنسیسی سرکار کا۔ میں نے اپنے پرانے استاد وہیلر (جنہیں اس وقت سر کا خطاب مل چکا تھا) کو ایک خط لکھا اور ان سے رہنمائی چاہی۔ انہوں نے مجھے لندن آنے کے لیے مجبور کیا لیکن وہاں کا کوئی وظیفہ میرے پاس نہ تھا۔ اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور آخر فیصلہ ہوا لندن ہی جانا چاہیے۔ میں نے تینوں فیلوشپ سے انکار کر دیا اور بیوی نے کہا کہ ہم اپنے خرچ پر لندن جائیں گے۔ اسی روز سے آدھی تنخواہ ہم ہر ماہ بچانے لگے۔ پیسے جمع کرنے میں پورے تین سال لگ گئے۔ 1953ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے سٹڈی (Study Leve) لے کر پوری فیملی کے ساتھ بذریعہ بحری جہاز لندن روانہ ہو گیا۔ اس وقت میرے دو بچے تھے۔ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق مجھے آدھی تنخواہ ملتی تھی جو اس وقت کے تقریباً پینتالیس (45) پاؤنڈ کے برابر بنتی تھی۔ ہمارا ہر ماہ خرچ پچاس پاؤنڈ تھا۔

لندن کے پاکستان ہائی کمیشن میں ایک میرے دوست قریشی صاحب اس وقت ہوتے تھے۔ انہوں نے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام تھوڑے دنوں کے لیے ایشیاء ہوٹل جو سیکر ٹریٹ میں تھا کر دیا تھا۔ یہاں بھی قریب قریب سارے ہماری طرح کے لوگ تھے جو ہندی یا اردو بولتے تھے۔ میں نے اپنی بیوی کو انگریزی بولنے پر اصرار کیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی گھر میں سیکھ چکی تھی لیکن بولنے کی عادت نہیں تھی۔ میں پہلے دن ہی ان کو چھوڑ کر ایجنٹ پارک چلا گیا وہاں اس وقت آثاریات کا انسٹیٹیوٹ ہوا کرتا تھا۔ وہاں سر مار ٹیمر وہیلر سے ملاقات کی۔ ان کی معرفت گارڈن چائیلڈ سے ملا۔ انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے داخلہ کے امتحان کا ذکر کیا۔ میں فوراً تیار ہو گیا لیکن سر مار ٹیمر نے کہا کہ وہ میرا امتحان لے چکے ہیں۔ وہ میرے استاد رہ چکے تھے اور میرے۔ کام سے اچھی طرح واقف تھے۔ بغیر امتحان کے میرا داخلہ ہو گیا۔ اس وقت کے ہندوستانی آثاریات کے پروفیسر کاڈرنگٹن کے پاس مجھے بھیج دیا گیا۔ وہ اونچے پائے کے پروفیسر تھے لیکن ان کی مخصوص

پسند ہندوستان کے فنون لطیفہ پر تھی۔ جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں ڈھاکہ سے ایک مسودہ لے کر آیا ہوں جس کا عنوان ہے بنگال میں فن تعمیر تو وہ سن کر بہت خوش ہوئے اور یہی مضمون پی۔ایچ۔ڈی کے لیے منظور کر لیا گیا۔ پروفیسر کاڈرنگٹن نے کبھی میرے مسودہ کو نہیں دیکھا۔ ان سے آٹھ پندرہ دن میں ملاقات ہوتی۔ کبھی ایک مضمون پر کبھی دوسرے پر ان سے بات ہو جاتی۔ وہ مجھ پر بہت ہی مہربان تھے۔ کینٹ میں جہاں ان کی رہائش تھی اپنے گھر پر کئی دفعہ کھانے کی بھی دعوت دی۔ میں نے بھی اپنے فلیٹ پر کھانے کی دعوت دی۔ اس سے بھی زیادہ دوستی میرے ہم جماعتی مسٹر اور مسز الجن سے ہو گئی جو دونوں اس وقت پی۔ایچ۔ڈی کے طالبعلم تھے۔ ان سے ہمارے گھریلو تعلقات ہو گئے۔ پروفیسر کاڈرنگٹن سکول آف اورینٹل اور افریکن سٹڈیز میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے مجھے وہیں جانا پڑتا تھا۔ وہاں کی لائبریری میں پڑھنا شروع کر دیا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا بھی فیلو ہو گیا اور وہاں کی لائبریری سے فائدہ اٹھانے لگا۔ اسی سکول میں ایک اور لیکچرار تھے جن کا نام مسٹر اے ایچ کرسٹی تھا۔ وہ برصغیر کی آزادی سے پہلے انڈین سول سروس میں فائز تھے۔ بعد میں پنشن لے کر یہیں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان کے دماغ میں ابھی تک شہنشاہیت کی بوتھی اور وہ یہی کہا کرتے تھے کہ جہاں گورا آدمی نہیں گیا ہے وہاں اندھیرا ہے۔ گو کہ میرا اپنا رنگ گورا ہی تھا لیکن میں ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا تھا کیونکہ ان کا اشارہ ہندوستان کی طرف تھا اور مجھے اس ملک سے بڑا پیار تھا لیکن میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے ان کے ساتھ میری یاری بڑھتی گئی اور ان کے ہی توسط سے میں نے رائل انتھراپالی جیکل انسٹیٹیوٹ جانا شروع کر دیا اور وہاں کی لائبریری بھی استعمال کرنے لگا۔ وہیں مجھے ایک مسودہ ڈاکٹر اورمین کا ہاتھ لگا جس کے بنا پر انہیں ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ملا تھا۔ یہ مشرقی ہند اور جنوب مشرقی ایشیاء کے آخری دور حجری کی تہذیب پر لکھا گیا تھا۔ پڑھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس مسودے میں بڑی خامیاں ہیں چونکہ میں خود ہندوستان میں کام کر چکا تھا اور اس وقت پروفیسر Zoinar زائنر کے کلاس میں بھی جاتا تھا اور ان سے حجری دور کے متعلق معلومات حاصل کرتا تھا۔ میں نے ہمت کی کہ اس نئے مضمون پر کام کرنا چاہیے۔ انگلینڈ میں جہاں کہیں بھی اس پر مواد ملتا اسے جمع کرتا۔ ان کو پرکھتا اور اپنے نوٹ بنالیتا۔ اس کے

بعد گرمیوں کی چھٹی میں فرانس چلا گیا۔ وہاں پروفیسر ہنری بردل اور پال لیوی سے کچھ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ پروفیسر بردل مجھے پیرس کے سارے میوزیم میں لے جاتے اور دنیا کے ہجری زمانے کی ہر چیز کو سمجھاتے۔ انہیں کی توسط سے میں میزے دالوم گیا اور وہاں جمع کردہ ہر وہ مواد میرے سامنے رکھا گیا جو انڈیا، چین (ویت نام) سے لایا گیا تھا۔ خزانہ کا ایک نیا دروازہ میرے سامنے آشکار ہو گیا۔ فرانس نے مجھے وہ چیز سکھائی جو میں انگلینڈ میں حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ان سارے نوٹس کو اکٹھا کر کے میں نے ایک نئے تھیس کا مسودہ گرمیوں کی چھٹیوں میں تیار کر لیا اور میں نے پروفیسر کا ڈرنگٹن سے عرض کی کہ میں اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مضمون بدلنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب ان سے یہ کہا کہ میں جنوبی مشرق ایشیاء کے لیے ہجری دور پر (Thesis) مقالہ دینا چاہتا ہوں تو وہ پہلے حیران ہوئے اور پھر کہا کہ اس پر تو مسٹر کرسٹی کام کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے کام کر لیا ہے اور اپنا ٹائپ شدہ مسودہ ان کے سامنے رکھا۔ انہوں نے مسٹر کرسٹی کو بلوایا اور ساری بات بتائی۔ مسٹر کرسٹی نے ناگواری کا اظہار کیا اور طے پایا کہ اگلی میٹنگ میں اس کا فیصلہ ہوگا۔ مسودہ مسٹر کرسٹی اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ ہفتوں کے بعد وہ لے کر آئے اور کہنے لگے کہ تم نے کام کر لیا ہے اب تم اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مستحق ہو۔ میں نے ان سے کہا کہ کبھی کبھی کالا آدمی بھی روشنی پھیلا سکتا ہے۔ اسی دوران پروفیسر کا ڈرنگٹن نے مجھے سکوں پر کام کرنے کے لیے کہا۔ کیونکہ اس مضمون پر انہیں ایک لیکچر دینا تھا۔ میں اس پر بنارس میں کام کر چکا تھا اس لیے میرے لیے یہ مشکل نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب سے کئی دفعہ اس پر بحث ہوتی اور ہم ایک دوسرے کی رائے سے فائدہ اٹھائے۔ اب دو اکیڈمی سیشن بھی ختم ہونے کو آئے۔ میں نے ڈھاکہ واپسی کی تیاری بھی کر لی اور پروفیسر صاحب سے کہا کہ میرا امتحان ہو جانا چاہیے تاکہ پاس ہونے کے بعد ڈگری مل جائے۔ انہیں بتایا کہ میں نے جون 1955ء کے شروع میں واپسی کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ وہ ہمیشہ ٹال دیتے۔ پھر میں نے پروفیسر گارڈن چائلڈ سے بات کی اور پروفیسر زائینر سے بھی کہا۔ مجھے معلوم ہوا کہ جب تک میں سکوں پر لکھ کر نہیں دوں گا میرا امتحان نہیں ہوگا۔ بہر حال میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اب جون میں نہیں جا سکتے۔ مجھے اور محنت کرنی ہے اور سکوں پر لکھنا ہے۔ جب میں نے یہ کام کر کے پروفیسر کا ڈرنگٹن کے سپرد کر دیا تو وہ میرے ممتحن مقرر ہوئے اور تاریخ طے

ہوئی۔ میں نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ آپ نے تو میرا مسودہ پڑھا ہی نہیں امتحان میں کیا ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا کہ انہیں میرے کام پر پورا اطمینان ہے۔ میرا کام ٹھیک ہی ہوگا۔ بہرحال امتحان ہوگیا۔ پروفیسر رائینز اور کرنل گارڈن میرے ممتحن مقرر ہوئے۔ امتحان کے بعد مجھے مبارکبادیاں ہوئیں اور میں واپس اپنے ملک آنے کے قابل ہوا۔ اس کے بعد میں نے پروفیسر کاڈرنگٹن سے کہا کہ جو کچھ میں نے سکوں پر لکھ دیا ہے وہ جلد بازی میں لکھا ہے یہ نامکمل خاکہ ہے۔ وہ سمجھ گئے اور ہنسنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کی بھاری سزا مجھے دینی پڑی جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اس کا سارا الزام آپ کے سر ہے اس ماہ میرے والد صاحب کا انتقال بھارت میں ہوگیا اور میں ان کا آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میرا دوسرا لڑکا نوید احمد جو لندن میں پیدا ہوا تھا' اس کو دیکھیں گود میں لے کر پیار کریں' مجھے کامیابی پر مبارکباد دیں اور گلے سے لگائیں لیکن اللہ میاں کو منظور نہ تھا۔ میرے دل میں اپنے پروفیسر کے خلاف ساری عمر شکایت رہ گئی کہ انہوں نے مجھے میرے والد صاحب سے دور رکھا اور ان کی محبت بھری آرزوؤں کو میں پورا نہ کرسکا۔ یہ ارمان لے کر اور اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

جب میں نے دیکھا کہ میری بیگم ایشیاء ہوٹل میں رہ کر انگریزی نہیں سیکھ سکتیں تو میں نے فیصلہ کیا کہ اب ایسی جگہ رہائش اختیار کرنی چاہیے جہاں انگریز رہتے ہوں۔ ہمیں ایسا فلیٹ 31 سینٹ سٹیفن گارڈن پڈنگٹن میں مل گیا جو ہندوستانی مسلمان مسٹر امجد علی کا تھا۔ یہ بی بی سی اردو پروگرام میں کام کرتے تھے۔ ان کا تعلق پہلے حیدرآباد دکن سے تھا اور انہوں نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس زمانہ میں لندن میں باہر کے رہنے والے بہت کم تھے۔ اکا دکا نظر آتے تھے۔ لندن شہر مکمل طور سے انگریزوں کا شہر تھا اور یہاں کی حالت ڈسپلن' صفائی' چال چلن' آداب سب انگریزوں کے زیراثر تھیں۔ جو بھی باہر کے لوگ اس وقت یہاں سکونت پذیر تھے انہیں انگریزوں کے ہی رنگ ڈھنگ میں خود کو ڈھالنا پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے ہی فلیٹ کے اوپر ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اے بی ایم حبیب اللہ اپنی بیوی کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ ایک روز صبح کے وقت وہ لنگی پہنے سگریٹ خریدنے باہر نکل گئے۔ بس کیا تھا شور مچ گیا۔ مسٹر امجد علی

میرے پاس آ گئے اور مجھے ڈاکٹر حبیب اللہ کی حرکت کا اشارہ کیا اور شکایت کی اور کہا کہ انہیں فلیٹ خالی کرنا پڑے گا۔ بہت سمجھانے پر اس غلطی کو معاف کرنے پر وہ تیار ہوئے۔ دوسری بار یاد ہے ہم اپنے یہاں سے دور نکل گئے۔ میری بیگم شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جب بس سے باہر نکلے تو بچوں نے شور مچا دیا کہ یہ دیکھو Lady sleeping suit (عورت سونے والے کپڑے میں) باہر آ گئی ہے۔ ایک اور دفعہ ہم نے بچوں کو رات کا کھانا کھلا کر انہیں سلا دیا اور ایسے ہی سیر کرنے نکل گئے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا کہ چلو بس میں بیٹھ کر دور چلتے ہیں۔ ہمیں اطمینان تھا کہ بچے سو گئے ہیں۔ جانے میں کوئی حرج نہیں لیکن واپسی تک دیر ہو گئی۔ جب گھر واپس پلٹے تو دیکھتے کیا ہیں بچے اکٹھے دوسرے بستر پر سو رہے ہیں اور ان کے پاس کھلونے رکھے ہیں۔ ہمیں تعجب اور پریشانی ہوئی کہ کیا ہو گیا۔ صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ بچے رات میں نیند سے بیدار ہو گئے تھے اور شور مچا کر رو رہے تھے۔ ساتھ والی انگریز خاتون نے وہاں آ کر جان بچائی۔ بچوں کو کھلونے دے کر چپ کرایا اور سلا دیا۔ پولیس والے نہیں آ پائے تھے۔ اس برتاؤ سے ہمیں وہاں کے نظم و ضبط کا پتہ چلا اور اس کا اندازہ ہوا کہ زندگی کس قدر منظم ہے۔ اس کا بھی اندازہ ہوا کہ پڑوسی انگریز ہم لوگوں کا انسانی ہمدردی کے تحت کتنا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ انسانیت سب جگہ برابر ہے۔ چاہے وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ جو برتاؤ میرے ساتھ کرسٹی نے یونیورسٹی میں کیا وہ اس کا اپنا طریقہ تھا جس کی وجہ اس کا اپنا تجربہ تھا جو اس نے ہندوستان میں اپنی (یعنی انگریزوں کی) شہنشاہیت کے زمانے میں سیکھا تھا۔ اس کے برعکس انگریزوں کا دوسرا پہلو بھی ہے جس کی بنا پر وہ ہر انسان کو انسان سمجھتے ہیں اور انہیں اپنے نظام کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس امید سے کہ وہ بھی ایک اچھے انسان بن جائیں۔ انسانی اخلاق کا بہترین اثر ہمارے دل پر چھپ گیا اور ہم سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ انگریز صرف شہنشاہیت کا ہی مالک نہیں بلکہ ایک سچا انسان دوست بھی ہو سکتا ہے۔

میں جب کبھی اپنے انسٹیٹیوٹ جاتا وہاں ایک ہی آدمی سب کام کرتا نظر آتا۔ وہی صفائی کرتا' وہی بجلی کا کام کرتا' میکینک بھی وہی ہے۔ ڈاک بھی وہی لاتا اور لے جاتا اور کبھی جلسہ عام ہوتا تو اس کا بھی سارا انتظام وہی کرتا۔ میں سوچتا کہ وہ یہ سب کام کیسے کر سکتا ہے۔ کسی کام کو کرنے میں وہ عیب محسوس نہیں کرتا۔ ہمارے ملک میں ایک آدمی چوکیدار ہوتا ہے وہ سارا دن بیٹھا

رہتا ہے۔ دوسرا آفس کی صفائی کرنے آتا ہے۔ تیسرا بیت الخلا صاف کرتا ہے۔ چوتھا دفتروں کی ڈاک ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ پانچواں ڈاک پہنچاتا ہے۔ چھٹا پانی یا چائے پلانے پر مامور ہے اور ساتواں عام جلسوں کے لیے کرسیاں لگانے پر مقرر کیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کام کو ہاتھ لگانا برا سمجھتے ہیں۔ سستی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر حکم چلاتے ہیں یا نکتہ چینی کرتے ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ میرا کام نہیں۔ اپنے انسٹیٹیوٹ میں سب پروفیسروں کو پڑھتے پڑھاتے دیکھا اور سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے دیکھا۔ ہم کیوں ایسا نہیں کرتے۔ ہم میں کیوں غلامانہ بو ابھی تک بھری ہوئی ہے۔ کیا ہم پر ذات پات کا اثر ہے لیکن مسلم ہونے کے باعث تو ہم میں ذاتی تفرقات نہیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ صرف خیالی باتیں ہیں یا پھر ہم میں پرانی سلطنت کی بو ابھی تک موجود ہے۔ یا اور کوئی سماجی برائی ہے جسے ہم سمجھنے سے قاصر ہیں اور ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ ہماری مشرقی تہذیب ہے اور ہم مغربی لوگوں سے بہت جدا ہیں۔

وہاں صبح صبح اٹھ کر دودھ کی بوتل لینے کے لیے نیچے جانا پڑتا تھا، کبھی کبھی دودھ لانے والے انگریز سے ملاقات ہوجاتی تھی وہ گاڑی پر دودھ کی بوتلیں لاتا، خود ہی اٹھاتا اور گھر گھر رکھ جاتا۔ کئی دفعہ راستہ میں اس سے ملاقات ہوجاتی۔ جب اس نے سنا کہ میں پاکستانی ہوں تو ایک دن وہ اپنی ساری کہانی سنانے بیٹھ گیا۔ وہ راولپنڈی میں ایک فوجی کرنل تھا۔ شان سے بنگلوں میں رہتا تھا۔ دفتر میں اور گھر میں نوکر چاکر تھے، باورچی تھا۔ اس کے علاوہ بیٹ مین الگ ہوتا تھا۔ وہ زمانہ گزر گیا۔ یہاں سب کام ہمیں خود کرنا پڑتا ہے۔ اب دیکھو میں دودھ بیچ رہا ہوں۔ میں نے کہا اس میں تمہیں شرم نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں تو کوئی کرنل یہ کام نہیں کرے گا۔ وہ بولا شرم کی کیا بات ہے۔ اس سے میری روزی چلتی ہے۔

مجھے گھر سے اسٹیشن تک پیدل جانا پڑتا۔ راستہ میں کئی انگریز نظر آتے جو سڑکوں پر صفائی کرتے۔ ایک دن میں نے ایک انگریز سے پوچھا کہ تم یہ کام کب سے کررہے ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ جنگ عظیم کے دوران فوج میں کپتان تھا اور ہندوستان میں رہتا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ یہاں آگیا اور اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کے بعد اس کے سوا اور کوئی ملازمت نہیں ملی وہ

بہت خوش ہے اس کی روزی تو چلتی ہے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور تو تھا کہ کیا یہ کام ہمارے فوجی کپتان کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک اور انگلینڈ میں قدروں کا فرق ہے۔ ہم ایسا کوئی پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہتے جسے ہم نیچ سمجھتے ہیں۔ انگلینڈ میں کوئی پیشہ اونچا یا نیچا نہیں ہوتا۔

ایک دن میں بازار میں جا رہا تھا کہ ایک پاکستانی مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم یہاں کیا کرتے ہو۔ اس نے بتایا کہ میں اپنے ملک میں کرنل تھا یہاں تربیت کے لیے آیا تھا۔ موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ یہاں کام بہت ہیں اور پیسہ بھی کافی ملتا ہے بس میں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور یہاں ایک پیکٹ بنانے کی فیکٹری میں کام شروع کر دیا۔ پیکٹ بناتا ہوں اور وہیل پر وہیں اکٹھے کرتا ہوں اور اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ پاکستان میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ میرا ایک دوست ہے جو پاکستانی سفارتخانہ میں کام کرتا تھا۔ کسی طرح سے استعفیٰ دے کر اب بس میں کنڈیکٹری کرتا ہے۔ بڑے پیسے بناتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم یہ کام پاکستان میں کرو گے اس نے جواب دیا کہ وہاں میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ تو نیچ لوگوں کا کام ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا ہے۔ بس پیسہ بناتا ہوں۔ یہی میرا مقصود ہے۔ کیا تھا خیال اس زمانہ میں ہمارے پاکستانی بھائیوں کا۔ انگریزوں کے وہ مزدور جو ان کے نوآبادکار علاقوں میں ہوتے تھے اب قلت کی وجہ سے اور سیاسی تبدیلی کی وجہ سے ان کے اپنے ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ یہی مزدور بڑھ کر اب ابھر آئے ہیں اور اب لندن، مانچسٹر وغیرہ شہروں کے بازار اور گلی کوچوں پر چھا گئے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی پیسہ کمانے وہاں آ گئے ہیں اور اب لندن شہر ایسا لگتا ہے کہ باہر کے لوگوں کی یہاں بھرمار ہو گئی ہے اور یہاں کے طور طریقے بدلتے جا رہے ہیں۔ یہ گاڑی کہاں جا کر رکے گی کہنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے نئے گھر کے پڑوسی انگریزوں سے بھی ہماری یاری بڑھتی گئی۔ ایک بوڑھا شخص ہمارے اوپر والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ جب کبھی اس سے ملنے کا اتفاق ہوتا وہ سلام کرتا اور کبھی موسم کا حال دریافت کرتا۔ اس سے سرسری طرح سلام دعا ہوتی رہتی لیکن ہمیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ہم دونوں کون ہیں اور ہم کیا کرتے ہیں۔ کبھی زیادہ بات نہیں ہوتی۔ ٹرین میں بھی انہیں لوگوں سے کئی دفعہ ملاقات ہوتی۔ گم سم بس چپ سادھے ہم ٹرین میں سفر کرتے تھے جیسے ہم میں کوئی انسانی محبت

نہیں۔ بلکہ چپ چاپ الگ تھلگ فخر سے گردن اٹھائے یا نیچے رکھے کبھی اخبار پڑھتے چلے جاتے۔ میں نے بھی یہی چال اختیار کر لی۔ راستہ میں کتابیں رکھ لیتا، کبھی اپنی کبھی فرانسیسی زبان کو پڑھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی جرمن زبان کی مشق کرتا اور کبھی عربی زبان کو پھر دہراتا۔ ڈھاکہ میں فارسی کی مشق کر ہی لیا کرتا تھا۔ اسے پڑھنے میں کوئی دقت مجھے نہیں ہوتی تھی۔ یہ ٹرین کا سفر مجھے بڑا موافق آیا اور انگریزوں کے برتاؤ نے مجھے یہ موقع دیا کہ ان زبانوں کو میں سیکھ سکا۔

ہمارے اوپر والے فلیٹ میں ایک فیملی رہتی تھی۔ ان کی ایک عورت مسز سائمن کبھی کبھی ہمارے گھر کام کرنے آ جاتی تھی۔ وہ بڑی باتونی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے اکثر باتیں کرتے اسے دیکھا۔ بڑی تیز عورت تھی۔ دودھ بیچنے والے کے ساتھ بڑی باتیں کرتی، اس کا خاوند ایک معمولی میکینک تھا جو سائیکل پر روزانہ اپنے کام پر جاتا تھا۔ ایک روز وہ سخت بیمار ہوگیا۔ نیچے ہمارے پاس آیا اور چابی دے کر ہمیں بتایا کہ وہ ہسپتال جا رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہاری بیوی کہاں ہے اس نے جواب دیا کہ اسے کہاں فرصت وہ سینما دیکھنے گئی ہے۔ جب وہ آئے تو گھر کی چابی اسے دے دینا۔ میری بیوی اور میں ہم دونوں حیران ہوئے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ایک اور ہمارے پاکستانی دوست تھے جو بینک میں کام کرتے تھے۔ جن کا نام مسٹر منہاس تھا۔ اکثر ہم ان کے گھر جاتے تھے۔ ان کی ایک پڑوسن مسز نیلسن تھی۔ ایک دن جب ہم وہاں گئے تو مسز منہاس نے کہا کہ اس انگریز عورت کا بوڑھا خاوند مر گیا ہے چلو ہم افسوس کرنے چلیں۔ ہم اس کے پاس گئے اور اس سے افسوس کرنے کی خواہش کی۔ ابھی ہم افسوس کے کلمات کہہ ہی رہے تھے کہ اس عورت نے ہم سے کہا کہ وہ اتنی مشغول رہی کہ ابھی تک اسے رونے کی فرصت ہی نہیں ملی ہے۔ یہ سن کر ہم دبے پیر واپس آ گئے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس نے اس طرح کیوں کیا۔ بہر حال یہ اس عورت کا اپنا طریقہ تھا جو کم از کم ہمارے مشرقی طریقوں سے بالکل مختلف تھا۔

ایک اور واقعہ میں لکھنا بھول گیا کہ اس نئے گھر میں آنے سے قبل اور بہت سے گھر ہم دیکھنے گئے۔ ہم کرایہ کے لیے گھر تلاش کرتے رہے۔ ایک انگریز دوست نے مجھے اور میری بیوی کو ایک فلیٹ دکھایا جو ہمیں پسند آ گیا۔ بات بھی طے ہوگئی۔ میں نے کہا کہ شام کو آ کر پیشگی

کرایہ دے دیا جائے گا۔ شام کو ہم اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو لے کر خوشی خوشی وہاں گئے۔ بڑا لڑکا انیس احمد ابھی دو سال کا ہی ہوا تھا۔ اسے ہم پرام میں بٹھا کر لے گئے۔ اب وہ گھر آنے ہی والا تھا کہ تھوڑی تھوڑی بارش شروع ہوگئی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ خیال تھا کہ گھر آنے ہی والا ہے وہاں اندر گھس جائیں گے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے گھنٹی بجائی تا کہ ہم اندر چلے جائیں۔ مالک مکان نے شاید دور سے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ تھوڑی سی کھڑکی کھول کر ہمیں کہا کہ اب فلیٹ خالی نہیں ہے۔ کرایہ پر چڑھ گیا ہے۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بارش ہو رہی ہے ہمیں تھوڑی دیر ٹھہرنے تو دو بچے بھیگ رہے ہیں۔ اس نے جھٹ سے کھڑکی بند کر لی اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ الٹے پاؤں اس بارش میں واپس آئے۔ آپس میں کہنے لگے کہ یہ کیسا برتاؤ ہے۔ اگر کرایہ پر مکان نہ دینا تھا نہ دیتے۔ ہمارے ساتھ بچے تھے کم از کم بارش سے بچنے کی مہلت تو دے دیتے بعد میں ہم نے سنا کہ بچے چونکہ شور مچاتے ہیں ان کے ساتھ کرائے کا مکان ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپس میں ہم نے کہا کہ یہ درست ہی سہی ایسے موسم میں تو کچھ خیال کرنا چاہیے۔ اس برتاؤ پر ہم کئی دفعہ باتیں کرتے۔ اس کے بعد جب کبھی ہم گلیوں سے گزرتے ماں کے ساتھ چین میں ایک کتا بندھا ہوا دیکھتے اور دوسرے ہاتھ میں اس کا اپنا بچہ اسی طرح زنجیر میں بندھا کھینچتا چلا آتا۔ ہمیں حیرانگی ہوتی کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ بچہ اور کتا دونوں کے ساتھ ایک ہی سلوک ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کتے پالتے ہیں لیکن بچوں سے سلوک ہمارا ہمیشہ کتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ کتوں کو پیار کرنا انہیں پچکارنا اور بات ہے لیکن یہاں تو کتے اور بچے میں کوئی تمیز نہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

بہت دن جب گزر گئے میرا کام بھی ختم ہونے کو آیا۔ ایک دن راستہ میں میرے پرانے واقف کار شیخ محمد اکرام سے ملاقات ہوگئی۔ شیخ صاحب پرانے انڈین سول سروس کے آدمی تھے۔ اچھے مورخ بھی تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کام کیسا چل رہا ہے۔ میں نے بتایا کہ ختم ہو گیا ہے۔ صرف امتحان باقی ہے۔ انہوں نے پھر کہا کہ میں یہیں رہنے کی کوشش کروں۔ میں نے جواب دیا کہ واپس جانے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ ہم یہاں نہیں رہ سکتے ہماری طبیعت مشرقی ہے۔ جب تک ہم یہاں کے چال چلن کو نہ اپنا لیں ان کی تہذیب میں خود کو نہ سمو لیں اس

وقت تک یہاں نہیں رہ سکتے۔ نوکری شاید مل جائے' پیسہ بھی زیادہ ہاتھ آ جائے لیکن کم از کم میری فیملی یہاں کے لوگوں میں مدغم نہیں ہو سکتی اس لیے ہم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔ شیخ صاحب یہ سن کر بڑے چونکے۔

اب کہ آخر وہ دن آ گیا کہ ہم پانی کے جہاز میں بیٹھ کر پھر واپس آ رہے تھے۔ سمندر کی پانی میں بھیگی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہم اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک روز میں ڈیک پر بیٹھے سوچ رہا تھا کہ میں نے انگلینڈ میں کیا کھویا کیا پایا۔ آنے سے پہلے شعبہ تاریخ کے میرے چیئرمین پروفیسر حلیم صاحب مجھ سے بار بار کہتے کہ میں اپنا پیسہ خرچ کر کے لندن کیوں جا رہا ہوں۔ اس وقت میں ریڈر یعنی ایسوسیٹ پروفیسر تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک وہ وفات نہ پائیں میں پروفیسر اور چیئرمین نہیں ہو سکتا لیکن میں یہی جواب دیتا کہ اعلیٰ ڈگری حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اب میں نے وہ ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ مجھے کیا فائدہ ہوا۔ ڈگری کے لیے دو مقالے میں نے خود لکھے۔ میرے استاد کاڈرنگٹن نے اسے پڑھا بھی نہیں ان سے باتیں ضرور ہوئیں لیکن علم میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ پھر جب میں پروفیسر زائینر کو یاد کرتا تو کچھ اور ہی سوچتا یہ ما قبل تاریخ (Prehistory) کے پروفیسر تھے۔ ان کے لیکچر سے میں بہت مستفید ہوا۔ وہی فائدہ پروفیسر گارڈن چائیلڈ' پروفیسر ملوون اور بہت سارے عمومی لیکچرار مثلاً سر لیونارڈ اوے وغیرہ سے ہوا۔ اس کے علاوہ سکول میں پروفیسر اے ایل بیشم سے ملاقات ہوگئی۔ ان سے کافی دوستی ہوگئی۔ انہیں کے اصرار پر میں نے وہاں کے شعبۂ تاریخ کے ہفتہ وار سیمینار میں جانا شروع کر دیا۔ پھر جب میں لائبریریوں کا خیال کرتا اور وہاں کے طالبعلموں کے بارے میں سوچتا۔ کس طرح طالبعلم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ استاد ان سے کس طرح سخت سے سخت کام لیتے ہیں اور ان سے پیار بھی کرتے ہیں کیونکہ بہت سے طالبعلم سکول میں غیر ممالک سے آتے تھے۔ استاد مختلف طریقوں سے ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ میں نے کبھی یہاں طالبعلموں کو ہڑتال کرتے نہیں دیکھا۔ حصولِ علم میں اس قدر مشغول ہوتے کہ ہڑتال کی سوچ بھی نہیں آتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سیاست پر بحث نہیں کرتے تھے لیکن یہ صرف معلومات کی حد تک تھی۔ جب میں اس بات کا ڈھا کہ یونیورسٹی کی حالت سے مقابلہ کرتا تو پریشان ہو جاتا کہ وہاں اور یہاں میں

زمین آسمان کا فرق تھا۔ طالبعلموں کی ہڑتال کے علاوہ کچھ استاد بھی ان کو اکساتے اور ملک کے سیاستدان تو طالبعلموں کو گروہ میں بانٹ دیتے۔ مجھے خیال آتا کہ کس پرلطف فضا میں وہاں دن گزارے اور علم حاصل کرنے کی بھی ہر آسانی حاصل تھی۔ میں نے آخر کیا حاصل کیا۔ کیا میں نے جتنے روپے خرچ کیے وہ کام آئے۔ یکا یک خیال ہوتا کہ میں نے کیا نہیں حاصل کیا۔ اپنے استاد سے نہ سہی عام طور سے میرے خیالات میں بڑی تبدیلی آئی۔ اس سے پیشتر مجھ پر بنارس کا بڑا اثر تھا۔ وہاں کے استادوں کا میں بے حد ممنون تھا کہ مجھے سیاست سے دور نکال کر تعلیم کی راہ پر لگا دیا۔ انہیں کو دیکھ کر میں نے محنت کرنا سیکھا لیکن وہ علم کسی قدر محدود تھا۔ زیادہ تر کتابی تھا۔ خاص کر یادداشت کو بڑھانے کا تھا۔ اس کے برعکس لندن میں میرا دماغ ایک دم کھل گیا۔ سوچنے سمجھنے کا مادہ بڑھ گیا۔ مجھے سامنے ایک نئی دنیا نظر آنے لگی۔

اب میں پھر مغرب سے مشرق کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ میرے دماغ پر مغرب کی سوچ کا بوجھ تھا۔ یہ زیادہ تر لندن اور تھوڑی بہت فرانس اور سپین سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہرحال مغربی تہذیب کا زندہ جاگتا تجربہ میں نے حاصل کر لیا۔ لندن شہر کی گہما گہمی' اس کی صفائی' آنے جانے کی سہولت' وہاں کے باغات' بازار اور دکانیں۔ اتنے لوگوں کی بھرمار ہونے کے باوجود کسی قسم کی ہنگامہ آرائی میں نے نہیں دیکھی۔ مجھے ووٹ بھی دینے کا اتفاق ہوا۔ ظاہر ہے میں نے لیبر پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دینا تھا سو دیا لیکن کوئی مار پیٹ اور جوش و خروش نظر نہیں آیا۔ میں کبھی اپنے ہمسایوں سے پوچھتا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ ہمارے ملک میں تو ہنگامے ہی ہنگامے ہوتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ ہم بچپن سے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دیتے ہیں۔ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ اپنے ملک میں بچوں کو ڈانٹنے میں یا پھر لاڈ پیار میں ان کو بگاڑ دیتے ہیں۔ یہاں پیار سے کہا جاتا ہے کہ تمہیں یہ کرنا چاہیے تھا۔ میرے استاد مجھے کہتے کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں اس طرح کرتا۔ یہ سن کر مجھے شرم آتی۔ ہم تو اپنے طالبعلموں سے اس طرح پیش نہیں آتے۔ ہم تو رعب کے ساتھ کہتے ہیں اور طالبعلم بے چارہ ڈر جاتا ہے۔ یہاں کوشش کی جاتی ہے کہ آرام سے طالبعلموں کو سوچنے کا موقع دیا جائے۔ اس کی بات سنی جائے اور اس کی رائے لی جائے اور اصلاح کرتے وقت اسے اس طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ اسے ایسا محسوس ہو کہ اس کی سوچ

میں کوئی غلطی تھی۔ اس لیے خیالات کو اپنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ اس کی دلیل بہتر ہے۔ دلیلوں کے ساتھ یہاں باتیں کرنا عام معمول تھا۔ یہ ضروری تھا کہ ایک شخص دوسرے کو کس طرح قائل کرسکتا ہے اور اپنی بات منوا سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دوسرا شخص حقیقت کو مان بھی جاتا تھا۔ اس میں نہ زور و جبر تھا اور نہ شخصی تعریف یا الزام۔ ہمارے یہاں تو تعریف کے پل باندھ دیتے ہیں یا پھر الزام پر الزام لگاتے ہیں۔ ایسی پرسکون اور اطمینان کی زندگی میں سیاست بھی اسی طرح کی ہوتی ہے۔ شاید اسی کا نام جمہوریت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نظر نہیں آتا۔ سب ہی لوگ اتنی تیز رفتاری میں مشغول نظر آتے کہ کسی کو بات کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ آخر یہ کیا کرتے ہیں۔ وہاں آپس میں مقابلہ اتنا زیادہ ہے کہ اگر محنت نہ کریں تو گزارہ نہیں۔ شاید اسی کی بدولت ملک میں ترقی ہوتی گئی۔ ہر آدمی کو فکر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ وہ اسی دنیا میں بہتر سے بہتر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور اس بہتری کے لیے وہ ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ جو سوچتا ہے وہی کہتا ہے اور وہی کرتا ہے۔ مجھے وہاں دوغلے پن کی مثال نہیں نظر آئی۔ گرجا گھروں میں لوگوں کو میں نے جاتے دیکھا۔ مذہبی تذکرے بھی سنے۔ بڑے بڑے کیتھڈرل بھی دیکھے۔ کئی پادریوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ اخلاق کی باتیں بھی سنیں لیکن اس دنیاوی زندگی کا معاملہ ہی اور تھا۔ یہ دنیا زندہ رہنے کے لیے ہے، اسے ترک کر کے دوسری دنیا پر آس لگانا ان لوگوں کی طبیعت کے خلاف تھا۔ ان کا اخلاق سماجی تقاضوں کے موافق تھا اور وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ دوسری دنیا میں بہتری کے لیے ہم یہاں ثواب کمائیں۔ ہمیں یہاں بہتر زندہ رہنے کے لیے آپس میں مل جل کر رہنا ہوگا۔ آپس کے جھگڑوں کو مل بیٹھ کر دور کرنا ہوگا۔ باہمی تعلقات قائم کرنا بہت ضروری ہیں۔ اسی میل جول سے ہم ملک کو ترقی دے سکتے ہیں۔

یہ تھے مغرب کے خیالات جو میرے دماغ پر چھا گئے اور کبھی میں سوچتا کیوں نہ میں وہیں رہ جاتا اور انہیں میں مدغم ہو جاتا۔ ان کے ترقی یافتہ ملک میں موج کرتا اور اپنے اور اپنے بچوں کی زندگی بہتر بناتا۔ مغرب نے کس طرح اپنی تجدید کی ہے اور مشرق کس طرح قدیم خوابوں میں گم ہے اور میں پھر بھی مشرق کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں کیا لے کر جا رہا ہوں اور اپنے ملک

میں مجھے کیا حاصل کرنا ہے۔شاید مغرب کا یہ پیغام مجھے وہاں پہنچاتا ہے۔انگریز اتنے سالوں کے بعد بھی میرے ملک کو نہیں بدل سکے۔اتنا کامیاب ضرور ہوئے کہ میرے ملک کو جدید دور کے دروازہ تک پہنچا دیا۔اس کے لیے ہم انگریزوں کے مرہونِ منت ہیں اور ان کی زبان انگریزی کے۔کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنی زبان چھوڑ دوں۔اپنی تہذیب وثقافت کو ترک کر دوں۔اپنا وطن چھوڑ دوں۔نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔میں جس طرح اب مشرق جا رہا ہوں اسی طرح مجھے اپنے لوگوں کو لے کر مشرق سے مغرب روانہ ہونا ہے۔میں ان خیالات میں گم بیٹھا وہیں کرسی پر سو جاتا۔

O-----O-----O

باب سوم

ع   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اپنی بیماری کا ذکر اس سے پہلے باب میں کئی دفعہ کر چکا ہوں۔ بیماریاں عام قسم کی تھیں جس میں کبھی مجھے بخار ہو جاتا۔ کبھی ملیریا اور کبھی ٹائیفائیڈ۔ اس سے پڑھائی میں نقصان ضرور ہوتا لیکن میں نے کبھی پڑھنا نہیں چھوڑا۔ بیماری کے وقفہ سے فائدہ اٹھاتا رہا اور ان چیزوں کا علم حاصل کرتا رہا جو شاید مجھے تعلیمی اداروں میں کبھی نہیں مل سکتی تھیں۔ سکول اور کالج کے زمانے میں جو میں نے ہندو روایات کو سیکھا اور ان کے متعلق کتابوں کو پڑھا پھر کبھی انہیں دہرانے کا موقع نہیں ملا۔ یہ علمی ذخیرہ مجھے بعد میں بہت کام آیا اور اسی کی بدولت میں اس قابل ہوا کہ میں مختلف مذاہب اور روایتوں کا مقابلہ کر سکتا تھا اور انہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس مطالعہ نے میرے دل سے کٹڑپن "Fanatisum" کو خارج کر دیا اور میں ہمیشہ ایک انسانی تہذیب کی تلاش میں گم رہتا۔ میری کوشش یہی رہتی کہ میں انسانی کارناموں کی تحقیق کروں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ پرکھوں اور اجاگر کروں اور لوگوں میں یہ بات عام کروں کہ مختلف دور سے انسان کیسے ہے۔ کن کن دشواریوں کا اس نے سامنا کیا ہے اور کس طرح انسانی تہذیبوں کا عروج وزوال ہوتا رہا ہے اور پھر بھی انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ راہ سب کے لیے کھلی ہے جو انسانی گروہ اس راہ پر چلتا رہے گا اور جو اس راہ سے پرے ہٹ کر اپنے آپ کو جدا رکھے گا اس میں منجمد ہونے کے زیادہ امکانات ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ سست اقوام میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہم تاریخ کے سلسلے کو نہیں روک سکتے۔ اس مسلسل دھارے میں ہم بھی بہتے رہتے ہیں۔ کسی موڑ پر ہم اٹک سکتے ہیں اور اس کی وجہ سے پچھلی قدامت کی گندگی ہم پر چھا سکتی ہے اور ہم اپنے آپ کو اسی قدر ماحول میں گھرا پاتے

ہیں۔ اس گھیرے سے نکلنا آسان نہیں۔ پھر زمانے کے دھارے میں واپس آنا بڑا مشکل اور کٹھن مرحلہ ہے کیونکہ منجمد گندگی ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے؟ یہ سوال مجھے ہمیشہ ستاتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسری بیماری مجھے ایسی لگی کہ اس سے چھٹکارا مجھے کبھی نہیں ملا۔ یہ دراصل بیماری نہیں تھی۔ یہ جسم پر سفید داغ تھے جسے انگریزی میں لکوڈرما اور اردو میں برص کہا جاتا ہے۔ اس سے مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہوتی چونکہ میرا رنگ قدرتی سفید تھا۔ بہت روز تک اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔ سب سے پہلے یہ کمر کے دونوں طرف چھوٹے نشان سے ہوئے۔ کسی نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ سب سے پہلے یہ نشان امرتسر میں شروع ہوا اس وقت میری عمر آٹھ نو سال کے قریب تھی۔ میرے والدین کو بڑی فکر ہوئی اور مجھے کئی حکیموں کے پاس لے کر گئے۔ میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنے کھیل کود میں مست رہتا۔ ایک دفعہ جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو میرے والد صاحب ایک امریکن ڈاکٹر ڈیسٹر کے پاس لے گئے جو مشن ہسپتال جگدل پور میں ہمارے گاؤں کے قریب ہوتے تھے۔ میرے چچا غلام حسین تو سخت علیل تھے وہ بھی وہاں داخل تھے۔ میں بھی وہاں داخل ہو گیا۔ ہم لوگ سب چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتے تھے کیونکہ ہسپتال میں رہائش کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ہماری جھونپڑی کے چاروں طرف جنگل تھا۔ وہاں شیر اور چیتے کا بھی خطرہ ہوتا تھا اس لیے ساری رات آگ جلا کر سوتے۔ اس وقت میرے گھٹنے میں بھی سفید داغ کے نشان پھیل چکے تھے۔ ڈاکٹر نے میری اس بیماری کے ساتھ تجربہ شروع کیا۔ چند ماہ میں وہاں رہا۔ مجھے اب پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ شاید یہ بھی ایک بیماری ہے جس کا علاج ضروری ہے۔ ڈاکٹر کے علاج سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور نشان بڑھتے گئے۔ اس کا بہت بڑا نفسیاتی اثر مجھ پر ہوا جس کی وجہ سے میں کافی سالوں تک احساس کمتری میں مبتلا رہا۔ جیسے جیسے یہ سفید داغ چہرے اور ہاتھ پر پھیلنے لگے بہت سے ہم جماعت مجھ سے کنارہ کشی کرنے لگے۔ میں اپنے آپ کو دیکھتا اور سوچتا کہ آخر یہ کیوں ہوا۔ اس زمانے میں نماز کا میں بڑا پابند تھا۔ دعا مانگتا کہ میرے نشان مٹ جائیں۔ بہت روتا لیکن نشان بڑھتے ہی گئے اور میں اپنے ہی آپ میں گم ہونے لگا۔ کبھی کبھی جان بوجھ کر لوگوں سے نہیں ملتا' جب میں ناگپور میں پڑھتا تھا تھوڑی بہت پریشانی مجھے ضرور ہوتی

لیکن میرے نزدیکی دوستوں کا دائرہ بڑھتا گیا کہ میرے بالوں کے ساتھ ملنے جلنے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ البتہ میرے اپنے آپ کے رویے میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں پڑا۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہتا کہ لڑکیاں مجھے کس نگاہ سے دیکھتی ہوں گی۔ میں اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ضرور کھیلتا لیکن اکیلے میں کبھی نہیں ملتا۔ لڑکیوں کی طرف سے بالکل بیگانہ ہو گیا۔ گو کہ میں جوان تھا صحت بھی میری ٹھیک تھی؛ پڑھنے لکھنے میں بھی معقول تھا۔ میرے گروہ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود میں ان سے دور رہنے کی کوشش کرتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ یہ احساس کے خیال بنارس میں بھی قائم رہا۔ اس کی وجہ سے میں کئی کئی دن کمرے میں بند رہتا اور پھر میرے دوست پکڑ کر مجھے نکالتے تو میں بہانا کرتا کہ مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ شاید اسی بہانے میں دن رات پڑھتا رہتا۔ کسی کسی دن میں اتنا زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا کہ لڑکیوں کو دیکھ کر دور بھاگتا اور میرا دل گرا گرا سا لگتا۔ اس احساس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا اور میں گھنٹوں یا تو بستر پر لیٹے رہتا یا پھر گنگا کے کنارے جا کر لوگوں کے ہجوم کو دیکھتا۔ اس سوچ کی ابتدا ہائی سکول سے ہوئی تھی۔ جب میں رائے پور میں پڑھتا تھا۔ وہاں بھی میں ہاسٹل سے باہر نکل جاتا اور درخت کے سایے میں گھنٹوں تنہا بیٹھا سوچتا رہتا اور کبھی اپنی سوچ کو کاغذ پر لکھ کر پھینکتا جاتا۔ لکھائی کا یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری ہوا اور شاید اسی عادت نے مجھے لکھنے کے قابل بنایا۔

میری اداسی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے آپ کو تنہا ''اکیلا بے سہارا'' قسمت کا مارا اور کسی قابل نہیں سمجھتا تھا۔ ایک عجیب سا نفسیاتی خوف مجھ پر طاری ہو گیا اور یہ خاص اس وقت تک رہا جب تک پورے جسم میں سفید داغ پھیل نہیں گئے اور میرا رنگ ایک جیسا ہو گیا۔ اس کے بعد ہی میری کمتری کا احساس دور ہوا اور مجھے لوگ سمجھنے لگے کہ میں پاکستانی نہیں بلکہ کسی یورپی ملک کا رہنے والا ہوں۔ اس سے میں خوش تو ضرور ہوتا لیکن مجھ میں احساس برتری کبھی نہیں آئی۔ بازار میں مجھے نقصان ہوتا رہا اور لوگ مجھ سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرتے رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے میں نے کراچی ہوائی اڈے سے ایک ٹیکسی کی اور شہر جانے لگا۔ ڈرائیور نے مجھے خوش ہو کر بڑی تیزی سے بٹھایا۔ میں بھی بغیر کچھ کہے بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کا یہ خیال تھا کہ میں باہر ملک کا رہنے والا ہوں وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب

میں نے اس سے اردو میں بات کی وہ پلٹ کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا اور پوچھا کہ کیا میں پاکستانی ہوں۔ جب میں نے جواب دیا کہ میں پاکستانی ہوں تو اس نے فوراً گاڑی کھڑی کی اور مجھے یہ کہہ کر اتار دیا کہ میں کہاں اسے زیادہ پیسے دینے لگا۔ میں نے لاکھ شور مچایا لیکن وہ مجھے راستے پر ہی اتار کر بغیر پیسے لیے چلا گیا۔ میں سر پیٹ کر رہ گیا اور اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ میرے بدن کا رنگ بھی کیا میری اپنی غلطی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے میں پھر احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دوسرا واقعہ امریکہ میں ہوا۔ نیو یارک سے بذریعہ ہوائی جہاز مجھے مانچسٹر جانا پڑا تاکہ میں وہاں اپنے ہونے والے داماد سے مل سکوں۔ اطلاع میں نے کر دی۔ تین پاکستانی دوست مجھے لینے بھی آئے لیکن وہ ڈھونڈتے رہے کہ یہ پاکستانی پروفیسر کہاں ہے۔ کوئی زرد رنگ کا آدمی ہوگا۔ میں نے انہیں دور سے دیکھا اور سمجھ گیا کہ یہ میری تلاش میں ہیں۔ پیچھے سے گیا اور ایک لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ کیا آپ اقبال بٹ ہیں۔ حیرانگی میں جواب ملا ہاں میں ہی ہوں۔ میں نے اپنا تعارف کروایا کہ میں پروفیسر دانی ہوں۔ ہم سب خوش ہوئے اور گھر آئے۔ ایک اور واقعہ 1974ء کا ہے جب میں فلاڈیلفیا سے ہارورڈ یونیورسٹی لیکچر دینے جا رہا تھا۔ میں نے وہاں کے پروفیسر کو لکھا کہ میں جہاز سے پہنچ رہا ہوں اور میری شناخت کے لیے میرے کوٹ پر پاکستانی پرچم کا ایک بیج ہوگا جو پروفیسر مجھے لینے آیا وہ اِدھر اُدھر ڈھونڈتا رہا۔ آخر میرے کوٹ کے بیج پر نظر پڑی۔ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے بالکل ٹھیک لکھا تھا کہ میرے کوٹ پر بیج ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

میری شادی کا مسئلہ

اسی برص کی بیماری کا جب میں شکار تھا میں بالغ ہونے کو آیا۔ اس وقت میں ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ ہاسٹل میں رہنے کی وجہ سے پابندی زیادہ تھی۔ پھر بھی ہم لڑکے جو اکٹھے رہتے تھے آپس میں عورت مرد کی جنسوں کے متعلق باتیں کرتے تھے اور ان کے متعلق کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ میرے ہم جماعت زیادہ تر اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی باتیں کرتے۔ میں نے اپنی عادت کو وقت کی پابندی میں ڈال رکھا تھا۔ صبح اٹھ کر روز نہاتا اور سیر کے لیے نکل جاتا تھا۔ اس

لیے اپنے آپ پر قابو پانا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ اس کے باوجود میرے اور بھی ساتھی تھے جنہیں فلم دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہمیں فلم دیکھنے کے لیے ہفتہ میں ایک دن اجازت تھی۔ ہم سارے لڑکے مل کر شہر جاتے' فلم دیکھا کرتے۔ ایک روز ایک تاریخی کھیل ''پکار'' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ فلم کی کہانی نے تو اثر کیا لیکن اس سے زیادہ اس کی خاص اداکارہ نسیم بیگم کی اپنی مورت نے متاثر کیا۔ وہ نور جہاں کا کردار ادا کر رہی تھی۔ اس کی مورت کی یاد آنکھوں میں رہتی لیکن لاہور شہر میں کوئی ایسی لڑکی میں نے نہیں دیکھی جو اس معیار پر اتر سکتی ہو۔ خیال ہوتا کہ اگر میں شادی کروں گا تو ایسی ہی لڑکی سے کروں گا۔

اس کے بعد میں پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ پہلے میں لکھ چکا ہوں کہ میرے چچا محمد سکندر دانی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے چونکہ انہوں نے ایک نئے ڈھنگ کی دکان کھول رکھی تھی جس میں بیچنے کے لیے اونچے درجے کی چیزیں شہر سے لے جاتے تھے۔ ان کا آنا جانا رائے پور شہر میں کافی ہوتا تھا۔ ان کا شوق بہت اونچا تھا۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت شاہانہ تھی۔ وہ اپنے والد کے گھوڑوں پر سواری کرتے۔ پہلی دفعہ ایک موٹر کار خرید کر رسنہ لے آئے۔ دھوم مچ گئی۔ ان کی فراخ دلی کی وجہ سے لوگ انہیں بادشاہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کی دو لڑکیاں اس وقت تھیں۔ چھوٹی لڑکی اپنی کمسنی میں فخر سے اپنا نام صفیہ سلطانہ دانی صاحب بتاتیں۔ بچپن ہی سے میں اپنے چچا کی دکان اور ان کے ساتھ گھر اکثر جاتا تھا کیونکہ ان کے یہاں نئے نئے قسم کے بسکٹ کھانے کو ملتے تھے۔ جب بھی وہ رائے پور آتے میرے لیے کچھ نہ کچھ چیز لے آتے۔ یہ کبھی کبھی اپنی لڑکیوں کو بھی رائے پور ساتھ لے آتے اور میں ان کے ساتھ ملتا جلتا اور باتیں کرتا۔ جیسے عام طور پر ہم اپنے چچیرے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔

میں ہمیشہ کشمیری لڑکیوں کی خوبصورتی کا قائل رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس علاقہ میں جہاں ہم لوگ رہتے تھے اور جس شہر میں جاتا رہا ان سب میں مجھے اپنے گھر کی لڑکیاں زیادہ خوبصورت نظر آئیں اور میں یہی سوچتا کہ اگر میں نے شادی کی تو اپنے خاندان کی لڑکیوں میں سے ہی پسند کروں گا۔ یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی کیونکہ اسلام کے قانون کے مطابق یہ جائز تھا اور ہمارے خاندان میں یہی رواج چلا آ رہا تھا۔ میرے پردادا' دادا' والد صاحب اور بڑے بھائی

صاحب اسی بٹ خاندان میں شادی کرتے رہے ہیں جو بسنہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے گھر اب بھی بہت لڑکیاں تھیں۔ ان میں ایک میری ہم عمر بلکہ اسی دن اور تاریخ کو پیدا ہوئی تھی۔ کچھ لڑکیاں مجھ سے چھوٹی بھی تھیں۔ بچپن سے میں ان کے گھر جاتا اور ان کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ انہیں کے گھر سے میرے بڑے بھائی کی بیوی جمیلہ بیگم آئی تھیں جو فیض محمد کی بڑی بیٹی تھیں اور سب سے بوڑھے بٹ صاحب خواجہ غلام محمد کی پوتی تھیں۔ وہ اکثر مجھے اپنی چچیری بہنوں کا حوالہ دیتیں اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا کہ میں انہیں میں سے کسی ایک کے ساتھ شادی کروں گا لیکن بدقسمتی سے میری والدہ کو جو اس خاندان سے تھیں یہ رشتہ منظور نہ تھا۔ یہ کشمکش میری بھابی اور میری والدہ کے درمیان ہوتی رہتی تھی۔ میں اسے ہمیشہ ساس بہو کا جھگڑا خیال کرتا اور کبھی اس کو اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس خیال میں میرے والد صاحب میرے ساتھ تھے۔ وہ اپنی بہو اور ان کے بچوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ میرا اس گھر سے تعلق اتنا ہو گیا تھا کہ جب کبھی میں امرتسر جاتا کبھی کبھی ان کے رشتہ داروں کے گھر بھی ٹھہرا کرتا تھا۔

اس کے برعکس میرے سب سے بڑے چچا غلام جیلانی دانی نے اپنی پھوپھی کی لڑکی زینب بیگم سے شادی کی۔ دوسرے چچا غلام حسین دانی نے انہیں کی چھوٹی ہمشیرہ سلیمہ بیگم سے شادی کی۔ چچا محمد سکندر دانی کی شادی میرے دادا کے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن دانی کی لڑکی اقبال بیگم کے ساتھ ہوئی اور انہیں کے بڑے بھائی عبدالحمید دانی کی شادی میری پھوپھی زہرا بیگم کے ساتھ ہوئی۔ اس طرح دانی خاندان کے لڑکے لڑکیوں میں آپس کے شادی شروع ہو گئی تھی۔ شادی کی آخری کڑی سے پتہ چلتا ہے کہ پنجابی محاورے کے مطابق وٹہ سٹہ کے طریقہ پر شادی شروع ہو گئی تھی۔ چونکہ ہمارے خاندان میں بچے بچیاں محدود تھے۔ آپس میں شادی کرنا لازمی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیں پنجاب یا کشمیر جانا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے میری سب سے بڑی بہن عائشہ بیگم کی شادی امرتسر میں میرے والد کی پھوپھی شاہ بیگم کے سوتیلے لڑکے محمد حسین کے ساتھ ہوئی جن کا ایک لڑکا مسعود الحسن تھا اور جن کے گھر میں امرتسر میں کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔ اسی طرح میری دوسری بہن تاج بیگم کی شادی امرتسر میں خواجہ عبداللطیف کے ساتھ ہوئی اور انہیں کے چھوٹے بھائی عبدالرؤف کے ساتھ میری تیسری بہن ہاجرہ بیگم کی شادی ہوئی۔ یہ کشمیری گھرانے کا بڑا جال ہے

جس میں دانی خاندان آپس میں منقسم تھے۔

جب کبھی چھٹیوں میں بسنہ جاتا میری والدہ رشتہ داروں کے بچوں کو دعوت دیتیں' کھانا کھلاتیں' کبھی کبھی رات کو بھی وہ رہ جاتے۔ میں ان کے ساتھ خوشی خوشی ملتا جلتا اور کھیلتا تھا چونکہ میرے چچا محمد سکندر دانی شروع میں میرے والد صاحب کے ساتھ ہی تجارت کرتے تھے ان کی لڑکیاں بھی اکثر ہمارے گھر آ کر رات گزارتی تھیں۔ جب وہ بڑی بھی ہو گئیں تب بھی آتی جاتی تھیں۔ میری بھابی مجھے چھیڑتی تھیں کہ میری شادی انہیں دونوں بہنوں میں سے بڑی حفیظہ بیگم کے ساتھ ہی ہوگی۔ میں شرم کے مارے چپ ہو جاتا۔

ایک دفعہ جب میں چھٹیوں میں بسنہ گیا تو میری پردادی سیدہ امرتسر سے آئی تھیں۔ ان کے اپنے پوتے عبدالحمید دانی سے ان کو بڑا پیار تھا۔ وہ بڑی بوڑھی تھیں اور میرے ساتھ بہت مذاق کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ میرے لیے عبدالحمید دانی کے گھر سے ان کی بڑی لڑکی کی ڈولی لائیں گی۔ میں جواب میں ہنس دیتا۔ اسی دوران جب میرے گھر میں بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہوگئی تھیں' میری نظر یکایک میرے چچا محمد سکندر دانی کی چھوٹی لڑکی صفیہ سلطانہ پر پڑی اور ایسا محسوس ہوا کہ اس کی شکل تو بالکل ویسی ہے جیسے میں نے فلم ''پکار'' میں نسیم بیگم کو دیکھا تھا۔ بس میں نے اپنی پسند کو پکا کر لیا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اس کی بڑی بہن کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی چھوٹی تھی۔ اس وقت شرم اور حیا کی عمر تک وہ پہنچی بھی نہیں تھی۔ خیر یہ ارمان لے کر میں رائے پور واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ جس دن مجھے جانا تھا اسی دن امرتسر سے آئے ہوئے رشتہ داروں کا پروگرام بھی کلکتہ جانے کا بنا۔ ان کے ساتھ میرے چچا محمد سکندر دانی کی دو لڑکیاں بھی گئیں۔ اس پروگرام کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ راستہ میں دریا مہاندی کے کنارے بیٹھ کر روٹی کھائی اور میں جی بھر کر صفیہ سلطانہ کو تاک تاک کر دیکھتا رہا لیکن مجھے کسی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

سال گزر گیا۔ ہائی سکول پاس کر کے میں رائے پور سے ناگپور کالج میں پڑھنے چلا گیا۔ وہاں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ ایک روز کسی نے خبر دی کہ میرے رشتہ دار سٹیشن پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں فوراً گیا اور وہاں میری ملاقات میری والدہ کی خالہ زاد

بہن جنہیں میں بھی سرور ماسی کہتا تھا ان کے ساتھ ہوئی۔ وہ اپنی بڑی لڑکی کے ساتھ بسنہ سے واپس امرتسر جارہی تھیں جہاں ان کا گھر تھا۔ ان کا بڑا لڑکا سعید حسن قمر تھا جنہوں نے ہندوستانی بحریہ میں ملازمت کررکھی تھی۔ ماسی نے بہت پیار کیا اور میری والدہ کا پیار بھی مجھے دیا اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی کہ میری والدہ نے ان کی لڑکی کے ساتھ میری بات کی ہے اور یہ بھی طے ہوگیا ہے کہ ان کے بڑے لڑکے سعید حسن قمر کی شادی میری چھوٹی بہن زاہدہ بیگم کے ساتھ ہونا ہے۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا لیکن کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد ٹرین آئی اور وہ امرتسر کے لیے روانہ ہوگئیں۔ امرتسر سے ان کی لڑکی کے ساتھ میری خط وکتابت بھی شروع ہوگئی۔ میں ہمیشہ ان کی لڑکی کو اپنی بہن سمجھ کر خط لکھتا لیکن وہ جواب میں کبھی لفافہ کے اندر گلاب کا پھول رکھ دیتیں اور کبھی محبت کی باتیں لکھتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

بہت سال گزر گئے، میں بنارس پڑھنے چلا گیا۔ اس دوران میرے چچا محمد سکندر دانی نے اپنے بہنوئی عبدالحمید دانی کے ایک لڑکے حامد سکندر کو گود لے لیا کیونکہ ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی ان کے یہاں ان کی بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ہمایوں سکندر رکھا گیا۔ بدقسمتی سے یہ لڑکا کینسر کی بیماری سے فوت ہوگیا۔ اس کے چند سال بعد حامد سکندر بھی فوت ہوگیا۔ میرے چچا صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔ عبدالحمید دانی نے اپنے دوسرے لڑکے محمد حنیف دانی کو انہیں دے دیا۔ یہ لڑکا کبھی اپنے والدین کے گھر اور کبھی محمد سکندر دانی کے گھر رہتا۔

جب میں بنارس میں پڑھتا تھا تو میں نے سیاست سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ سوائے ہندوستان چھوڑو (Quit India) تحریک کے پہلے دن کے جلسے میں شرکت کے بعد میں نے کبھی جلسے جلوس میں حصہ نہیں لیا۔ پڑھنے پر ہی اکتفا کیا اور اپنی زندگی کا مقصد وہی چنا جو اس کتاب کے عنوان میں ہے یعنی تجسس، تلاش اور تحقیق لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں ہندوستان کی سیاست کو سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پہلے لکھا ہے کہ میرے مسلمان ہونے کا زیادہ سے زیادہ احساس اسی بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوا۔ ایک روز ہمارے بہت سے دوست کمرے کے باہر بیٹھ کر باتیں کررہے تھے کہ دوسرا اہم جماعتی آیا جو علم فلکیات کا طالب علم تھا۔ وہ نجومی بھی

تھا۔ آ کر اس نے سب کے ہاتھ دیکھے اور کہنے لگا کہ عجیب سی بات ہے، سب کے ہاتھ بتا رہے ہیں کہ آج سے چند سال بعد ایسی تبدیلی آنے والی ہے جس سے ہم سب بچھڑ جائیں گے۔ اس کا مطلب ہم کوئی بھی نہیں سمجھ پائے لیکن اس وقت کی بدلتی ہوئی سیاست سے مجھے بڑی پریشانی ہوئی اور ہمیں ہمیشہ اپنے خاندان کے مستقبل کے متعلق سوچتا۔ میں یہی خیال کرتا کہ ہمیں بسنہ چھوڑ کر واپس کشمیر یا پنجاب جانا چاہیے۔

ایک دفعہ چھٹیوں میں بنارس سے بسنہ گیا۔ وہاں اپنے سارے بھائی بہنوں کو اکٹھا کیا۔ اس تقریب میں ہم نے بزرگوں (بوڑھوں) کو مدعو نہیں کیا۔ میں نے تقریر کی اور بھائیوں سے بھی بولنے کو کہا۔ میں نے ان سب کو یہی رائے دی کہ مستقبل قریب میں بڑی سیاسی تبدیلیاں آنے والی ہیں۔ ہمیں متحد ہونا چاہیے اور ایک ساتھ یہاں سے اٹھ کر کہیں پنجاب میں جا کر ایک دانی کالونی بنالینا چاہیے۔ میرے اور بھائیوں نے اتفاق کیا۔ ہماری ایک چھوٹی بہن جو عبدالحمید دانی کی بڑی لڑکی تھی بسنہ سکول میں پڑھتی تھی۔ بڑی تیز اور ذہین تھی اس نے بھی بولنے کی ہمت کی اور میری تجویز کی تائید کی۔ پھر میری نظر اپنے چچا محمد سکندر دانی کی لڑکی صفیہ سلطانہ پر پڑی جو اس وقت ہم سب کے لیے کھانا پکا رہی تھی۔ میری پرانی یاد تازہ ہوگئی اور اس پرانے خیال سے مجبور ہو کر میں نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ ہمیں خاندان میں ہی شادی کرنی چاہیے تا کہ خاندان کی یکجائی قائم رہے۔ اس کے تحت ہم نے لڑکے لڑکیوں کا ایک ایک جوڑا بنایا اور میں نے کہا کہ محمد سکندر دانی کی بڑی لڑکی کی شادی میرے بڑے چچا کے لڑکے محمد حسن دانی سے ہو اور میری شادی صفیہ سلطانہ کے ساتھ ہو۔ پہلی بار اس تجویز کو سامنے لانے کی ہمت مجھ میں ہوئی۔

جب اس کا انکشاف بڑوں کو ہوا تو کچھ لوگ ناراض ہوئے اور کچھ خوش بھی۔ سب سے زیادہ ناراضگی ہمارے پھوپھا عبدالحمید دانی کو ہوئی کیونکہ وہ اپنے دو لڑکوں کا رشتہ محمد سکندر دانی کی دو لڑکیوں سے کرنا چاہتے تھے۔ یہ رشتے اس کے اندر شامل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے خاندان میں وہ اکیلے سیاست میں پوری طرح سے حصہ لیتے تھے اور وہ کانگرس کے رکن بھی تھے۔ 1939ء میں تیرہجوا کانگرس کے جلسے میں شریک ہو کر وہ مجھ سے ملنے ناگپور بھی آئے تھے۔ انہیں یہ پسند نہیں آیا کہ ہم سب بسنہ چھوڑ کر پنجاب چلے جائیں۔ میرے والد صاحب کو سیاست سے

دلچسپی نہیں تھی۔ وہ غیر جانبدار تھے اور جو کوئی بھی ان کے پاس آتا انہیں خوش آمدید کہتے لیکن بعد میں وہ مسلم لیگ کے قریب تر ہوتے گئے۔ دو خط مجھے اسلام آباد کے قائداعظم کاغذوں میں دریافت ہوئے جس سے پتہ چلا کہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے غلام مرتضٰی کی معرفت قائداعظم کو اپنے گاؤں میں رقم اکٹھا کر کے دو مرتبہ بھیجی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کے حمایتی ہو گئے تھے اور شاید اسی کے پیش نظر پاکستان جانے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔

بنارس میں ایم-اے کا امتحان دے کر میں بھی واپس بسنہ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں شادی رچی ہوئی ہے اور یہ بھی شادی مابین محمد سکندر دانی کی بڑی لڑکی حفیظہ بیگم کی ہمارے چچا کے لڑکے محمد حسن دانی سے۔ مجھے بہت خوشی کہ میری تجویز کا پہلا مرحلہ حل ہو گیا۔ اس کے بعد فوراً خیال آیا کہ اب میری بھی شادی محمد سکندر دانی کی چھوٹی بیٹی صفیہ سلطانہ سے ہوسکتی ہے لیکن جب ہمارے چچیرے بھائی محمد حسن کی شادی ہو رہی تھی تو ہمارے پھوپھا عبدالحمید دانی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حفیظہ بیگم کی شادی ان کے بڑے لڑکے عبدالحفیظ دانی سے ہونی چاہیے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ جیسے ان کی اپنی شادی میں انہیں اپنے خسر غلام رسول دانی سے جائیداد ملی تھی اسی طرح محمد سکندر دانی کی جائیداد ان کے لڑکے کو مل سکتی تھی کیونکہ ان کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ بہر حال شادی ہوگئی اور حفیظہ بیگم محمد حسن دانی کی شریک حیات بن گئیں۔ میرے والد صاحب نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے عبدالحمید دانی سے یہ کہا کہ محمد سکندر دانی کی دوسری لڑکی صفیہ سلطانہ بھی ہے۔ اس کی شادی تمہارے دوسرے لڑکے سے ہوسکتی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے لیکن میری امیدوں پر پانی پھر گیا اور میں سمجھ گیا کہ اب میری شادی وہاں نہیں ہوسکتی۔ اتنے میں میرے امتحان کا نتیجہ آ گیا اور میں چھوٹا سامنہ لے کر بنارس واپس چلا گیا۔

پاکستان اور میرا خاندان

ہندوستان میں سیاست زور پکڑنے لگی۔ ہندو مسلم فساد بڑھنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سینکڑوں برسوں سے اکٹھے رہنے والے لوگ کیوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ کیا انگریز انہیں لڑاتے ہیں تاکہ اپنی پالیسی Divide & Rule کے تحت لوگوں میں تفریق

پیدا کریں اور ان پر حکومت کریں۔ شاید یہ بھی ممکنات میں ہو لیکن اصلیت یہ نظر نہیں آتی۔ میں نے جیسے پہلے باب میں لکھا ہے ہندو اور مسلمان میں سماجی تفرقات بہت گہرے تھے۔ اس کا ذکر بھی آچکا ہے کہ تہذیبی فرق بھی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اگر ان کو تاریخی پہلو سے دیکھیں تو ہندو اور مسلمان کا نقطہ نظر بالکل جدا جدا معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں مسلم قوم حاکم رہی ہے اور ہندو محکوم یہ اصل بنیاد تھی؛ ہندو اور مسلمانوں کے تضاد کی۔ اسے بڑھا چڑھا کر لوگوں کو اکسایا جا سکتا ہے اور اس طرح ان میں جوش وخروش پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تجربہ میں نے بنارس کی اپنی زندگی میں محسوس کیا لیکن عام آدمی ان تاریخی واقعات کو کیا سمجھے۔ عام آدمی تو روزمرہ کی زندگی میں مست ہوتا ہے۔ جب تک اس کو اپنے آپ کی زندگی پر ضرب نہ لگے وہ سیاسی جوش وخروش سے دور رہتا ہے۔ جس طرح میرے اپنے والد صاحب ہندو مسلم میں غیر جانبدار تھے لیکن زندگی کی دوڑ میں کشمکش کا پیدا ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ آخرکار ہندو اور مسلمان میں ظاہری اختلاف ان کے اپنے مذہب کا تھا۔ مذہبی رسمی تقاضے دونوں کے الگ الگ تھے۔ مندروں میں گھنٹیوں کا بجنا اور مسجد کے سامنے باجا بجانا اشتعال پیدا کر سکتا تھا۔ گائے کا گوشت اور اس کی ہڈیاں جو مسلمانوں کے کھانے میں کام کی ہوتی تھیں ہندوؤں کے گھر کے سامنے پھینکا جا سکتا تھا۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جو ہندو اور مسلمان میں دشمنی کا باعث ہو سکتی تھیں اور چونکہ یہ عام آدمی کی زندگی کے تجربہ کی بات ہے ان میں جوش پیدا کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ جب چاہے انگریز اس طرح کی حرکت کسی کے ذریعہ کرا سکتا تھا لیکن یہ سب اصل مرض کی علامتیں تھیں۔

جب میں پنجاب جاتا تو میری بڑی بہن کے شوہر خواجہ عبداللطیف جو نماز کے پابند اور بہت پرہیزگار تھے اکثر مجھے وہاں کا حال سناتے اور مجھے کہتے کہ دیکھو یہاں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی دکان سے سودا نہیں خریدتے۔ یہاں کے ہندو کھتری بڑے بڑے تاجر ہیں۔ مسلمانوں کا خون چوستے ہیں۔ مسلمان جو گاؤں میں کاشت کرتا ہے ان کو ادھار دے کر انہیں غریب سے غریب تر بنا دیتا ہے۔ اب اگر کوئی پشاور جائے تو ہاں بھی یہی حال پاتا ہے۔ وہاں بھی سب بڑے تاجر ہندو ہیں اور پٹھانوں کو قرض دے کر ان کا خون چوستے ہیں۔ یہی حالت کراچی میں ہے۔ ہماری اصلی لڑائی ہندوؤں سے اقتصادی ہے۔ جب تک ہم یہاں پاکستان نہیں بنا لیتے اور ہندو

یہاں سے چلے نہیں جاتے ہماری نجات نہیں ہوسکتی۔ میں ہمیشہ ان سے کہتا کہ آپ کیوں نہیں محنت کرتے۔ آپ کیوں نہیں بڑے بڑے تجارتی ہوتے۔ کیوں آپ ان سے ادھار لیتے ہیں' ان کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ پھر وہ مذہبی تفریق کی طرف آ جاتے اور وہ وہی نعرہ لگاتے جو گلی کوچوں میں سنا کرتا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ یہ جوش دلانے والے نعرے مسلمانوں کو متحد کرنے میں کام آتے۔ میں کبھی کبھی سوچتا کہ نعرہ اپنی جگہ جو اصل بات ہے وہ سماجی' تہذیبی' تاریخی اور اقتصادی تفرقات ہیں۔ ان میں تو انگریز کا کوئی ہاتھ نہیں۔ پھر ہم انگریز کی شکایت کیوں کرتے ہیں۔

اس کے بعد جب میری اپنی ملازمت کی باری آئی تو شملہ میں انٹرویو کے لیے مجھے اور دوسرے مسلم ساتھی ولی اسد خان کو مسلم اقلیت کی وجہ سے ملازمت ملی۔ اس وجہ سے خان صاحب کو ملازمت تو میری سمجھ میں آ گیا لیکن ان کا اپنا علمی پس منظر اس قابل نہ تھا کہ وہ عام امیدواروں کے مقابلہ میں آ جائے لیکن میں نے تو ہندو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں سب کے مقابلہ میں اول آیا تھا۔ اب کیوں میں اقلیتوں میں شمار ہو گیا؟ مسلمانوں کی یہ اقلیتی کیفیت کیسے بنی؟ کیا مسلمانوں کو برابری کا حق نہیں مل سکتا؟ کیا ہمیشہ مسلمان اقلیت میں رہا ہے؟ اگر یہی حال تھا تو اس نے سینکڑوں برسوں تک ہندوستان میں حکومت کیسے کی! اگر وہ حکمران طبقے میں شامل تھا تو آج وہ کیسے پست قوم بن گیا؟ یہ تاریخی تضاد مجھے ہر وقت پریشان رکھتا۔ میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کبھی قوموں کے عروج و زوال کی طرف نظر دوڑاتا پھر سوچتا کہ مسلمانوں کی اپنے علم میں' تہذیب و قابلیت میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ پھر وہ کیسے پست قرار دیا جانے لگا۔ ہو نہ ہو یہ کوئی سیاسی چال ہے جس کے ذمہ دار ضرور انگریز ہوں گے۔ دراصل ہم ایک نئے سیاسی دائرے میں کام کر رہے تھے۔ یہ دائرہ انگریز سرکار نے تیار کیا تھا جس میں سب سے اونچا درجہ ان کو حاصل تھا اور باقی ماندہ یہاں کے رہنے والے لوگ اپنا کردار و مقام خود ڈھونڈ رہے تھے اور بتا رہے تھے' یہ سیاسی دائرہ وہ تھا جسے ہندوستان میں انگریزوں نے رائج کیا۔ اسی دائرے کے اندر اور انہیں کے نافذ کردہ قاعدے و قوانین میں رہتے ہوئے ہمیں زندہ رہنا تھا۔ اس دائرہ میں ہمیں نمبر کے حساب سے اقلیت بنا رکھا تھا۔ میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور یہی سوچتا رہا کہ

اتنی محنت کے باوجود میں ہمیشہ کے لیے اقلیت میں شمار ہوگیا۔ اتنے سال حکومت کرنے کے بعد بھی اور ہندوستان کو زمانہ وسطیٰ کی اعلیٰ ترین تہذیب سے نوازنے کے باوجود آج مسلمان اقلیت میں شمار ہونے لگے۔ یہ ایک ایسی سیاسی شکست تھی جو میری اپنی ذات ہی قبول نہیں کرتی تھی اور جب میں خود اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا تو اور بہت سے مسلمان خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ وہ کس طرح اسے قبول کر سکتے تھے۔ یہ تھی بنیاد مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے ابھرنے کی۔ ان خیالات نے میری آنکھوں کو کھول دیا اور میرے سامنے وہ سارے واقعات تیرنے لگے جو سرحدی علاقوں میں رونما ہوتے رہے۔ ان علاقوں میں تو قبائلی لوگوں نے انگریزوں کو قبول ہی نہیں کیا کیونکہ وہ انگریزوں کے بنائے ہوئے سیاسی دائرہ میں آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی آزادی کی لڑائی ہمیشہ لڑتے رہے ہیں۔ انہوں نے آزادی کا پرچم ہمیشہ بلند رکھا۔ اس کے برعکس ہندوستان میں مسلمان انگریزوں کے بنائے ہوئے سیاسی جال میں پھنس گئے۔ اب اس اقلیتی حالت سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ ہم مسلمان بھی اپنے آپ کو اسی سیاسی اصطلاح میں پیش کریں یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے اوپر اقلیت کی مہر ثبت کرا کر زندگی گزار دیں۔ یا پھر اپنے آپ کو برابر سمجھ کر کوئی اور راستہ اختیار کریں۔ یہ بھی صرف انگریزوں کی اصطلاح میں ہوسکتا تھا۔ یہ تھی بنیاد مسلم قومیت کی جس کی وجہ سے ہم مسلمان اپنے آپ کو یکجا کر سکتے تھے اور اپنے لیے ایک مقام پیدا کر سکتے تھے۔ اپنا تشخص بحال کرا سکتے تھے۔ کیا اس کے ذمہ دار انگریز یا انگریزی تعلیم نہیں؟ اسلام میں قومیت کے معنی بالکل ہی مختلف ہیں۔ یہاں تو ہمیں انگریزوں کے لفظوں میں اظہار کرنا تھا۔ یہ تھی بنیاد سیاسی اختلاف کی جس نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ کیا اور انہیں اپنے وطن پاکستان کے لیے لڑنے پر مجبور کیا۔ انگریزوں نے جال بچھایا اور ہندوؤں نے ہمیں اس نئے راستہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا۔

یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے کبھی کسی ہندو شخص سے دشمنی نہیں کی اور یہی خیال کرتا رہا کہ ہم اس محدود دائرے سے نکل کر انسانیت کی وسیع فضا میں آزادی کا سانس لیں گے۔ اسی دوران میں پہلے دہلی آفس میں کام کرتا رہا اور پھر میرا تبادلہ آگرہ ہوگیا۔ دہلی میں میری ساری توجہ مسلمانوں کے فن تعمیر پر تھی۔ وہاں کی بے شمار عمارتوں کا مطالعہ کرتا اور انہیں سمجھنے کی کوشش

کرتا۔ جب میرا تبادلہ آگرہ ہوا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اب وہاں کی عمارتوں کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح مجھے مسلم فن تعمیر کا بہت اچھا تجربہ ہو جائے گا۔ میں آگرہ پہنچا اور وہاں اپنے بڑے افسر مسٹر مادھوسوروپ وتس کو اپنے آنے کی رپورٹ دے دی۔ وہاں کام کرنا شروع کر دیا ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس دفتر کے ہیڈ کلرک سے میری تکرار ہو گئی۔ میں ناتجربہ کار ضرور تھا لیکن ہر بات کو غور سے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہیڈ کلرک ہندو برہمن تھا۔ اسے میری تعلیم کے متعلق کوئی پتہ نہیں تھا۔ زور زور کی آواز میں مجھ سے کہا کہ کافی عرصہ سے وہ اس دفتر میں کام کر رہا ہے۔ اس کا باپ بھی یہاں ہیڈ کلرک تھا۔ بہت سالوں سے یہاں کوئی مسلمان افسر نہیں رہا پھر میں کیسے یہاں آ گیا اور کس طرح میں یہاں کام کر سکتا ہوں۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ میں تحمل سے اس کی بات سنتا رہا اور کہا جب تک میں یہاں تعینات ہوں مجھے یہاں کام کرنا ہے' چاہے وہ پسند کرے یا نہ کرے۔ کچھ دن اور گزرے ایک روز ہمارے محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل مارٹی مہرہ سلہبیر دہلی سے آگرہ تشریف لائے۔ وہ میرے استاد بھی رہ چکے تھے اور مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ یہاں آ کر میرے مطالعے کے متعلق پوچھا۔ حالت دریافت کی۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور ایک رقعہ میرے ہاتھ میں پکڑا کر مجھ سے کہا کہ اسے بعد میں پڑھوں اور کہا کہ اس کو پورا یقین ہے کہ میں اس کو نپٹ لوں گا۔ میں بڑا پریشان ہوا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے فوراً اسے کھولا اور پڑھا۔ اس کو پڑھ کر بڑی حیرانگی ہوئی۔ اس رقعہ میں دستخط کسی کے نہیں تھے۔ صرف میرے خلاف الزامات تھے کہ میں بدکار ہوں' میں عورتوں اور لڑکوں کے پیچھے جاتا ہوں اور میں اس آفس میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں ایک دم سمجھ گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ بہرحال اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بہت برداشت کیا اور چپ چاپ رہا۔

تھوڑے دنوں کے بعد مسٹر مادھوسوروپ وتس بیمار ہوئے۔ انہیں چار ماہ کی چھٹی لینی پڑی۔ دفتر کا پورا چارج مجھے مل گیا۔ میں پوری ذمہ داری سے کام کرتا رہا۔ ان دنوں ہر دفتر میں فصل بڑھانے کی مہم چلی تھی۔ ہمارے دفتر میں بھی باغ کو ختم کر کے سبزیاں وغیرہ لگائی جاتی تھیں اور ہفتہ میں ایک دن ان کا بٹوارا ہوتا تھا۔ آفیسر صاحب کے سامنے ساری سبزیاں رکھی جاتیں اور اس طرح بانٹی جاتی تھیں کہ آدھا حصہ آفیسر کو' اس کا آدھا ہیڈ کلرک کو' اس کا آدھا باقی کلرکوں کو'

اس کا آدھا چپڑاسیوں کو اور باقی جو بچا مالیوں کو۔ اس سے چھوٹے ملازم بڑے ناخوش تھے، میں نے اس طریقے کار کو بالکل الٹ دیا اور میں نے فیصلہ سنایا کہ سب سے کم آفیسر اس سے تھوڑا اور زیادہ ہیڈ کلرک اور سب سے زیادہ مالی حصہ لیں گے۔ بیچارہ ہیڈ کلرک روتا رہ گیا کیونکہ ہر ہفتہ اسے کافی مقدار میں یہاں سے سبزی مل جاتی تھی اور بازار سے بالکل خریدنا نہیں پڑتی تھی۔ میں نے حکم جاری کیا کہ میرے یہاں رہتے یہی طریقہ کار ہوگا۔ ہیڈ کلرک اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ بعد میں میرے پاس آیا اور رونے لگا۔ میں نے رقعہ اس کے سامنے رکھا جو وہ وسلہیر نے مجھے دیا تھا۔ پہلے تو میں نے کہا کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ جب میں نے ڈانٹ کر کہا کہ ابھی میں نے کام کرنا شروع کیا ہے اب اسے اور بھی مزا چکھنا ہوگا۔ میں ثابت کر کے بتاؤں گا کہ یہاں ایک مسلمان آفیسر بھی کام کر سکتا ہے۔ وہ گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا اور کہا کہ آئندہ ایسی حرکت پھر نہیں ہوگی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کا پڑھا ہوں۔ میں تمہارے باپ داداوں کی زبان اور تہذیب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری حرکتوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔

اس ہیڈ کلرک کی حرکت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر ڈائریکٹر جنرل انگریز نہ ہوتا اور وہ مجھے نہیں جانتا تو معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔ پھر کبھی سوچتا کہ کیا یہ حرکت اس کا نجی رویہ تھا یا اس میں بھی کوئی فرقہ وارانہ راز تھا۔ اس نے مجھے کیوں کہا کہ یہاں مسلمان افسر نے نہ کام کیا ہے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے ڈاکٹر انصاری یہاں بطور انجینئر کام کرتے تھے۔ چند سال پہلے یہاں خان بہادر ظفر حسن بڑے افسر تھے۔ میرے زمانے میں کیا تبدیلی ہوگئی۔ کیا مجھ میں کوئی کمی تھی یا ملک کی سیاسی فضا کا اثر یہاں بھی پہنچ گیا۔ میرے ہاتھوں اس ہیڈ کلرک کو پہلے کوئی نقصان نہیں پہنچا پھر کیوں وہ میرے خلاف ہوگیا۔ بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی کا پڑھا ہوں پھر بھی وہ ناک بھوں چڑھاتا تھا۔ کبھی کبھی میں دفتر میں ہندو تہذیب پر لیکچر بھی دیتا تھا۔ انہیں سنسکرت نظمیں بھی سناتا تھا لیکن میں اس کے تعصب کو کم کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ بعد میں جب میں نے دفتر والوں سے کہا کہ مجھے کرایہ کا مکان ڈھونڈ کر دو تو انہوں نے عیدگاہ علاقہ میں ایک دکان کا آدھا حصہ دلوایا جو مسٹر مادھوپ سوروپ کے مکان کے قریب تھا لیکن اس کے دوسرے حصہ میں ایک مسلم طوائف اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

وہ لڑکی بھی کبھی کبھی مسکراتی ہوئی میرے دروازہ تک آتی اور وقت پوچھنے کے علاوہ زیادہ باتیں کرنے کی ہمت نہ کرتی۔ میرے مکان پر اور شائقانہ طبیعت کے لوگ آتے اور اس لڑکی کی باتیں کرتے۔ میں ایک جوان لڑکا تھا اور یہ ممکن تھا کہ میں بھی اس لڑکی پر لٹو ہو جاتا۔ یہ شاید میری زندگی کی بڑی آزمائش تھی جس کے لیے ہمارے ہیڈ کلرک صاحب نے یہ کھیل کھیلا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس زمانہ میں کسی اور لڑکی کے خیال میں مخمور ہوں جسے میں دہلی چھوڑ کر آیا تھا اور جس کی یاد مجھے ہر لمحہ ستاتی تھی۔ بہر حال ایسی گری ہوئی چال کیوں کھیلی گئی۔ کیا یہاں بھی مجھ سے بدلا لینے کا ارادہ تھا جو کچھ بھی ہو کوشش تھی کہ میں ایک بہت بڑے پھندے میں پھنس جاؤں اور وہیلر صاحب کو یہ ثابت کیا جائے کہ میں سچ مچ عورتوں کے پیچھے جاتا ہوں۔ جب میں اس پھندے میں بھی نہیں پھنس سکا تو انہیں حیرانی ہوئی۔ اب وہ سوچنے لگے کہ میں بلاشبہ نامرد ہوں۔ میں اکثر وتس صاحب کے گھر جاتا۔ ان کے لڑکوں سے اور بیوی سے ملتا اور وہ بہت خوش ہوتے۔ میرے سنسکرت علم کی وجہ سے وتس صاحب بھی میری عزت کرتے اور گو کہ ان کی فیملی قدامت پسند تھی مگر مجھے کبھی یہ احساس نہیں دلایا کہ مسلم ہونے کے باعث میں ان کے گھر سے خارج ہوں۔ مجھے بھی ان کے لیے بڑا احترام تھا اور ہم میں نہ کبھی رنجش اور نہ کبھی ناانصافی پیدا ہوئی۔ اس وقت کی سیاست پر بھی ہم بحث کرتے اور ایک دوسرے سے اختلاف رائے ہوتا لیکن کبھی دل شکنی نہیں ہوتی۔ ہندو مسلم فساد کے متعلق بھی ہم بحث کرتے اور کبھی غور کرتے کہ آخر کیوں آپس میں مسلم بیٹوں اور ہندو جاٹوں کی خانہ جنگی ہوتی ہے۔ وہ بار بار مجھے سناتے کہ یہ دونوں قوم ایک ہی شاخ سے نکلے ہیں لیکن اب دیکھو ایک گرو ہندو ہے اور دوسرا مسلمان۔ آپس کی لڑائی نے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے ہیں۔ مکان نذر آتش کیے جا رہے ہیں۔ عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ بچوں کو چیڑ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ہجوم کا ہجوم آتا ہے اور ان کے پاس ایسے ہتھیار ہیں کہ دوسروں کے گلوں کو، ہاتھوں کو اور ٹانگوں کو کاٹتے چلے جاتے ہیں۔ گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں اور بچوں کو اس میں جھونک دیتے ہیں۔ کیا یہ انسانیت ہے۔ وحشی سے بھی زیادہ بدتر حرکت ہے۔ یہ حرکت کسی مہذب قوم کی نشانی نہیں۔ یہ صرف ہندو مسلم فساد نہیں بلکہ یہ کھلم کھلا خانہ جنگی ہے جس میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ دوسری قوم کا نام و نشان ہی نہ رہے۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی ہے۔ ہم تہذیب یافتہ

لوگوں کی حدود سے باہر نکل گئے ہیں۔

یہ احساس ہم دونوں کو ہوتا پھر بھی ہماری ہمدردی جدا جدا تھی۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی شکایت کرتے اور میں ہندوؤں کی طرف اشارہ کرتا۔ گوکہ ہم دونوں تاریخ اور تہذیب کے طالبعلم تھے۔ وِلس صاحب نے ہڑپہ کی تہذیب پر ایک مدبرانہ کتاب لکھی تھی اور میں نے اپنی زندگی میں انسان کو مختلف ادوار سے دیکھا تھا۔ پھر بھی یہ جدا جدا احساس کیوں۔ کیا ہم ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بھی سنسکرت جانتے تھے، ہندی بھی پڑھتے تھے اور پنجابی بھی بولتے تھے۔ اس کے علاوہ اس سارے شہر گل میں جو مسلم عمارتی یادگاریں تھیں ان کا مطالعہ بھی کرتے تھے اور ان کی حفاظت کا کام بھی کرتے تھے۔ وہی کام میں بھی کرتا تھا بلکہ اس زمانے میں وِلس صاحب دیوگڑھ مندر پر کام کررہے تھے۔ وہاں پتھروں پر کندہ بہت ساری مورتیاں اور ان کی تشکیل ہندو کتابوں سے لی گئی تھیں۔ مجھے کام سونپا گیا تھا کہ میں رامائن، مہابھارت اور پرانوں کو پڑھ کر ان کے حوالے دریافت کروں۔ چونکہ میں ان کتابوں کو پہلے ہی پڑھ چکا تھا، یہ میرے لیے مشکل نہیں تھا اس طرح ہم دونوں کا کام ایک دوسرے کے کام پر مبنی تھا۔ پھر بھی ہمارا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ ہمارے احساسات جدا جدا تھے۔ ہمارے طور طریقہ الگ الگ تھے۔ ہمارا کھانہ پینا مختلف، وہ سبزی اور دال کھاتے اور میں گوشت اور انڈا، ہم دونوں دفتر میں انگریزی پوشاک پہنتے تھے لیکن گھر آکر وہ دھوتی باندھتے تھے اور میں پائجامہ۔ جب کبھی ہم فتح پور سیکری کے کام کو دیکھنے جاتے تو وہاں کا مسلم خانساما میرے لیے الگ کھانا پکاتا اور ان کے لیے الگ۔ میں مسلم عمارتوں پر تیموریہ فن تعمیر کا اثر تلاش کرتا اور وہ کہتے کہ دیکھو اکبر کی عمارتوں میں کتنا اثر ہندو فن تعمیر کا ہے۔ اس طرح کی بہت ساری باتیں کرتے اور ہم اختلاف رائے رکھ کر بھی خوش ہوتے۔ کیا یہ خیالات محض عالمانہ تھے یا ان کا کوئی اثر ہماری روزمرہ کی زندگی پر تھا۔ اس کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ اس زمانے کی بگڑتی ہوئی سیاسی فضا میں توازن کو برقرار رکھنا بہت کٹھن کام تھا۔ جیسے ہماری ہمدردی جداگانہ سوچوں میں فرق پیدا کرتی چلی گئی اور ہم ایک دوسرے کے خیالات سے دور ہوتے چلے گئے۔ کبھی اس کا احساس بھی نہیں ہوا کہ ہم مل بیٹھ کر واقعات کو دلیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔ آخر ہم دونوں تاریخ داں تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ کم از کم ہم دونوں متفق ہوجاتے اور اپنے ہی دفتر سے

نفرتوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ ہم سے نہ ہو سکا اور ہم دونوں پڑوسی ہونے کے باوجود یکجہتی عام نہ کر سکے اور ہمارے درمیان نفرتوں کی ایک بڑی دیوار حائل رہی۔

یہ 1947ء کی بات ہے انہوں نے مجھے دعوت دی کہ ہم دونوں اکٹھے ان کے گھر میں بیٹھ کر اس وقت کے ہندوستان کے وائس رائے کی تقریر ریڈیو سے سنیں گے۔ میں ان کے گھر چلا گیا اور ہم بڑے غور سے تقریر سنتے رہے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آخر پاکستان بن ہی گیا، اس سے ان کو بڑا نقصان ہوا۔ ان کا ایک گھر لاہور کرشن نگر میں تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ پاکستان میں رہ گیا۔ میں نے جواب دیا کہ میرے سارے رشتہ داروں کی جائیداد امرتسر میں ہے وہ بھی یہیں دھری رہ گئی اور پھر میں نے اپنے والدین کا ذکر کیا جو بسنہ میں رہتے تھے۔ انہوں نے جان بوجھ کر پوچھا، میرا فیصلہ کیا ہے۔ میں کہاں رہنا پسند کروں گا۔ میں نے جواب دیا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ہمیں آخر پاکستان میں جانا ہوگا۔ ہمیں وہیں اطمینان وسکون میسر آ سکتا ہے ہم سکھ اور چین سے رہ سکتے ہیں۔ شام ہو گئی تھی۔ ہم ہاتھ ملا کر اپنی اپنی راہ پر ہو لیئے لیکن ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہندوستان کی طرف جا رہے ہیں اور میں پاکستان کی طرف۔

جوانی کی لہر

جب میں دہلی میں تعینات تھا تو مجھے وہاں کی عمارات کا مطالعہ کرنے پر لگایا گیا۔ مجھے ڈاکٹر انصاری کی مدد ملی۔ ان کا تبادلہ آگرہ سے دہلی کیا گیا اور وہ محکمہ آثاریات میں چیف انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کئی عمارتوں میں مجھے ساتھ لے کر وہاں انجینئرنگ اصولوں کو بتاتے۔ طرز تعمیر کو سمجھاتے اور کس طرح ان کی خستہ حالت کو سدھارا جائے۔ مختلف تراکیب بتاتے۔ دہلی کے قریب قریب ساری عمارتوں پر مجھے نوٹ لکھنے کے لیے کہا۔ میں لکھ کر ان کے سامنے لاتا اور پھر وہ اس پر بحث کرتے۔

دہلی میں اس وقت تک انہیں مکان نہیں ملا تھا۔ وہ ایک بڑے تمبو میں رہتے تھے۔ مجھے لودھی کالونی میں ایک فلیٹ مل گیا تھا۔ میرا آنا جانا سائیکل کے ذریعہ ہوتا تھا۔ ایک روز کام سے تھک کر بہت چور ہو گئے تو گرمی کے مارے وہ مجھے اپنے کیمپ میں لے گئے۔ ان کے رہائشی تمبو

کے سامنے درخت کے سایہ میں دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ اتنے میں اندر سے ایک میم نکلی اور ہماری طرف آئی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ ان کی جرمن بیوی ہے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا اور اپنی کرسی ان کو دی۔ اب تیسری کرسی کی ضرورت پڑی۔ وہ خود تمبو کی طرف جانے لگے۔ میں نے کہا کہ میں جا کر لاتا ہوں آپ تشریف رکھیں۔ وہ بیٹھ گئے اور میں پردہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا تو دوسرے دروازہ کا پردہ اٹھا اور ایک لڑکی اندر آئی۔ ہم دونوں ہی سہم گئے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پریشان ہو گئے۔ میں تھوڑا سمجھ گیا کہ ہونہ ہو یہ ڈاکٹر انصاری کی لڑکی ہے کیونکہ اس کا رنگ ماں کی طرح اور چہرہ باپ کی طرح تھا۔ ہم دونوں مسکرائے۔ میں نے کہا میں کرسی لینے آیا ہوں۔ وہ چپ چاپ اپنے کام میں مشغول ہو گئی اور میں کرسی لے کر باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ لڑکی چائے لے کر باہر آئی۔ ماں کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ انصاری صاحب نے بتایا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اسے ہم ایوی کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہم نے سلام کیا اور باتوں میں لگ گئے۔ اسے بھی معلوم ہو گیا کہ میں محکمہ آثاریات میں ایک نیا افسر لگا ہوں۔ شام ہوئی تو میں اپنے فلیٹ میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں اپنی سائیکل کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ اس کا سب سے چھوٹا بھائی میری سائیکل سے کھیل رہا ہے۔ وہ ضد کرنے لگا کہ سائیکل پر میرے ساتھ جائے گا۔ نا چاہتے ہوئے بھی مجبوراً میں اسے ساتھ لے گیا۔ اسے اپنے فلیٹ پر لایا۔ کچھ بسکٹ دیئے اور پھر واپس اس کے کیمپ میں پہنچا دیا۔ جب میں واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لڑکی تمبو کے سامنے کھڑی تھی۔ بھائی کو ڈانٹا کہ وہ سب کو اس طرح ستاتا ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں اس بہانے تھوڑی اور سیر ہو گئی۔ دوسرے دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر انصاری صاحب بمعہ اپنی بیوی اور بچوں کے دفتر چلے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ کیمپ میں بہت گرمی ہے۔ وہاں بیٹھا نہیں جاتا یہیں آفس میں ہی یہ سب بیٹھیں گے۔ اس زمانہ میں دفتر دس بجے سے پانچ بجے تک لگتا تھا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور میز کرسیوں کو پھر سے ترتیب دینے لگا۔ ہم سب اس طرح بیٹھے کہ میرے ساتھ ڈاکٹر انصاری' میرے ٹھیک سامنے ان کی لڑکی اور پاس ہی ان کے بھائی اور آخر میں ماں بیٹھیں۔ ہم سب اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے لیکن

ٹھہر ٹھہر کر میں آنکھ اوپر اٹھا کر دیکھتا اور وہ لڑکی سامنے نظر آتی۔ یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔ جب تک کہ میرا تبادلہ آگرہ نہ ہو گیا۔

اس دوران ڈاکٹر انصاری کئی دفعہ کھانے کے لیے کبھی گھر میں اور کبھی ہوٹل میں دعوت دیتے۔ ایک دفعہ وہ اپنی ساری فیملی کو قطب مینار بھی لیے گئے جہاں مجھے کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہیں ڈاک بنگلہ میں کھانے کا انتظام بھی کیا گیا۔ ہم سب نے مل کر وہاں کھانا کھایا۔ یہ دراصل میری الوداعی دعوت تھی اس کے بعد ہی مجھے آگرہ جانا تھا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ میری سوچ میری پسند مجھ سے جدا ہو رہی تھی۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ اس سے پہلے جب میں دہلی میں تھا اپنے فلیٹ میں تنہا سوچتا رہتا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ پرانی یادیں دفن ہو چکی تھیں۔ بسنہ کی لڑکی اب میرے دماغ سے اوجھل ہو چکی تھی۔ رشتہ داروں کی اتنی لڑکیوں کے چکر میں الجھ گیا تھا آخر سوچا انہیں چھوڑ کر کیوں نہ اب اس نئی لڑکی پر ہی تمام تر کوششیں کی جائیں۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر انصاری شاید مجھے پسند کرتے ہوں۔ میرے کام کو تو وہ پسند کرتے تھے۔ ممکن ہے رشتے پر بھی وہ راضی ہو جائیں۔ جب آخری دعوت انہوں نے مجھے دی تو حقیقت میں میں یہی سمجھا کہ اب بات بن گئی۔ پھر یہ سوچا کہ یہ دعوت شاید اس لیے دی ہے کہ میں ان کے ساتھ کام کرتا تھا اور اب میرا تبادلہ ہوا ہے اور یہ رسمی سی دعوت ہے۔ اس دماغی الجھنوں کے ساتھ میں آگرہ آیا اور دن رات اسی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ جب کبھی مجھے موقع ملتا میں کسی نہ کسی بہانے دہلی چکر لگاتا اور ڈاکٹر انصاری سے عمارتوں کے تحفظ کے متعلق باتیں کرتا۔ اس وقت تاج محل میں مرمت کا کام چل رہا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اس پر ایک کتاب لکھ چکے تھے۔ میں صلاح مشورہ کرنے اکثر ان کے پاس آتا رہتا۔ اسی بہانے ان کی لڑکی سے بھی ملاقات ہو جاتی لیکن بات کو آگے بڑھانے کی ہمت نہ ہوتی۔ واپس آگرہ آ کر پھر وہی خواب اور اس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی۔ میں اس کے خیال کو اپنے سے جدا نہ کر پاتا تھا۔ جب ہیڈ کلرک نے مجھ پر الزام لگایا اور بعد میں بہکانے کی کوشش کی تو میں ہنستا اور اپنے آپ سے کہتا اسے کیا معلوم کہ میری پسند تو دہلی میں ہے جس کے لیے میں بار بار وہاں کا چکر لگاتا ہوں۔ شاید اسی لڑکی کی یاد تھی جس نے مجھے اس طوائف کے چنگل سے بچایا جو میرے قریب مکان میں رہتی تھی۔

جنرل ڈیگال سے میری ملاقات

1946ء میں جب وتس صاحب چھٹی پر تھے اور آگرہ دفتر کی ذمہ داری میرے کاندھے پر تھی۔ ایک روز کا یک کمشنر صاحب کا فون آیا اور مجھے طلب کیا گیا۔ ملاقات میں مجھے بتایا گیا کہ انڈو چائنا (ویت نام) سے جنرل ڈی گول واپس آ رہے ہیں اور انہوں نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ حکومت ہند کے خاص مہمان ہوں گے، سیدھے آگرہ پہنچیں گے اور مجھے انہیں تاج محل دکھانا ہوگا۔ پوچھنے پر میں نے بتایا کہ مجھے فرانسیسی زبان بالکل نہیں آتی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں انگریزی میں ہی بولتا رہوں۔ جنرل ڈی گول انگریزی سمجھتے ہیں لیکن شاید وہ انگریزی نہ بولیں اور فرانسیسی زبان میں ہی گفتگو کریں۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اتنی کم عمری میں اتنے بڑے شخص کو خوش آمدید کہوں اور انہیں تاج محل دکھانے کا بھی شرف حاصل ہو۔ تاریخ اور فن تعمیر سے میں پوری طرح واقف تھا لیکن ایک انجانا سا خوف تھا کہ کس طرح بغیر فرانسیسی زبان سمجھے اس تاج محل کی خوبیوں سے آگاہ کروں گا۔ خیر جیسے ہی وہ جہاز سے اترے کمشنر صاحب نے میرا تعارف ان سے کروایا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور شاید سمجھا کہ اس جوان آثارِ شناس کو اپنی رائے سے آگاہ کرنا آسان ہوگا۔ ان کے ساتھیوں کے ساتھ تاج محل کے لیے روانہ ہوئے۔ مختلف زاویے سے میں نے تاج محل کی خوبیوں کو بیان کیا۔ خاص مزار تک پہنچتے پہنچتے کئی دفعہ وہ رکتے اور اپنی رائے کا زور سے اظہار کرتے۔ ایک جگہ کھڑے ہوگئے اور اپنی چھتری فرش پر مار کر مجھ سے دریافت کیا اس کا معمار کون تھا۔ میں نے جواب دیا کہ شاہجہان کو ڈیزائن بہت سے لوگوں نے پیش کیے۔ ان میں ایک اٹالین بھی ہوسکتا ہے جس کا نام تھا حروغو دادلوتا لیکن اصل ڈیزائن جو پسند کیا وہ بستاد عیسیٰ کا تھا اور وہی اس کا معمار تھا۔ بہت سے لوگ فرانسیسی اسٹفن ڈی یورڈو کو بھی اس کام میں شریک کرتے ہیں جبکہ یہ غلط ہے۔ میری رائے سے انہوں نے اتفاق نہیں کیا بلکہ بار بار زمین پر چھتری مار کے یہی کہتے رہے کہ اس کا معمار فرانسیسی کے علاوہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال آخر تک میں اپنی بات پر اڑا رہا اور انہوں نے اپنی رائے نہیں بدلی۔ جب تاج محل دیکھ چکے تو میری اپنی رائے پر قائم رہنے سے خوش ہوئے۔ اپنے ساتھ ہوٹل لے گئے۔ وہاں

کچھ دیر قیام کیا اور شراب نوشی کی اور آخر میں فرمایا کہ جب کبھی فرانس آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ حسنِ اتفاق جب میں فرانس گیا وہ برسر اقتدار تھے لیکن میں ان سے ملنے کی جرأت نہ کرسکا۔

میری چھوٹی بہن زاہدہ بیگم کی شادی

مادھوسوروپ وتس صاحب کی صحت یابی کے بعد وہ آگرہ دفتر میں واپس آ گئے اور مجھے دہلی سے حکم نامہ وصول ہوا کہ میں میسور کے لیے روانہ ہو جاؤں اور برہمگری کی کھدائی میں شریک ہوں۔ میں بڑا خوش ہوا کہ اب میں دفتر کے کام سے ہٹ کر پھر کھدائی کے کام میں لگ جاؤں گا۔ اس جگہ موریہ خاندان کے مہاراجہ اشوک کے مشہور کتبے کندہ تھے۔ اسی پہاڑی کے دامن میں بہت بڑا امیدان تھا۔ جہاں بہت سی بڑی بڑی قبریں جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو مارٹی مروہیلر صاحب ہم سب کو پہاڑی کے اوپر لے گئے۔ سامنے دیکھنے کو کہا اور پوچھا کہ کیا نظر آ رہا ہے۔ ہم نے جواب دیا کہ بہت سے پتھر نظر آ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے بتایا کہ ہر پتھر کے نیچے قدیم زمانے کی قبر ہے۔ مجھے ان قبروں کو کھودنے کے لیے تعینات کیا اور بی بی لال کو رہائشی جگہ پر لگایا۔ بعد میں الہ آباد سے جی آر شرما آئے اور میرے ساتھ کام کرنے لگے۔ مزدور مقامی مرد اور عورت دونوں ہوتے۔ ایک جوان کرناٹکی عورت اور اس کی لڑکی میرے پاس مزدوری کرتی تھی۔ میں انہیں جو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا وہ بالکل نہیں سمجھتیں تھیں۔ میں نے پھر کنٹری زبان سیکھنے کا فیصلہ کرلیا اور ان کے ساتھ بولتے بولتے کناڑی بولنے میں مہارت حاصل کرلی۔ جب بھی کھانے کا وقفہ ہوتا ہم بڑے پتھر کے سایہ میں بیٹھ کر بہت باتیں کرتے۔ شرما جی یہی کہتے کہ مجھے لڑکی سے عشق ہو گیا ہے۔ میں جواب یہی دیتا کہ یہ فیصلہ نہیں ہوا ہے کہ محبت لڑکی سے ہے یا اس کی ماں سے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری دوستی بڑھتی گئی۔

آخر میں مجھے حکم ہوا کہ مجھے واپس آگرہ جانا ہے۔ ہمارے اس کیمپ میں بہت سے ساتھی اکٹھے رہتے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک فرانسیسی آثارِ شناس کا جوڑا بھی تھا جن کا نام جے ایم کنال اور ان کی بیوی تھی۔ وہ وہیلر کی کھدائی کا طریقہ کار سیکھنے کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہیلر نے انہیں ہمارے ساتھ ہی کام کرنے کو لگا دیا تھا۔ شام کے وقت جب کام ختم ہو جاتا ہم اکٹھے بیٹھ کر

اپنی کھدائی کی باتیں کرتے اور موشیو کسالی ہمیں اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں فرانس کا حال سناتے۔ میری ان سے بڑی دوستی ہوگئی اور بعد میں جب بھی میں پیرس جاتا وہ مجھے اپنے گھر لے جاتے۔ میز ے گھر میں اپنی آثاریہ کی چیزوں کو دکھاتے۔ ایک رات کو کھانے کے بعد مجھے ساری رات مدھم روشنی میں پیرس شہر دکھایا۔ ان کے آخری وقت تک ہماری دوستی قائم رہی۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک تھاپر صاحب تھے جو ٹیکسلا کھدائی میں بھی میرے ساتھ تھے۔ بعد میں وہ بھارت سرکار کے محکمہ آثاریات کے ڈائریکٹر جنرل ہوئے۔ جب میں آنے لگا تو مجھے حکم ہوا کہ میں انہیں کھدائی کا کام سونپ دوں۔ ہم دونوں خندق پر کھڑے ہوئے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ یہ کیا معلوم تھا کہ ہماری ملاقات ہندوستان میں آخری دفعہ ہو رہی ہے۔ یہ الوداعی ملاقات ثابت ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ دردناک واقعہ اس مزدور لڑکی اور اس کی ماں کے ساتھ پیش آیا۔ وہ دونں لنگابت شاخ کے پیروکار تھے۔ میرے دانی نام سے وہ یہی سمجھتی رہیں کہ میں بھی کوئی ہندو برہمن ہوں۔ میں شاید ان میں سے کسی کو پسند کرلوں اور اپنے ساتھ لے جاؤں۔ جب میں جانے لگا تو دونوں کی آنکھیں پرنم تھیں۔ وہ میرے سامنے نہ ٹھہر سکیں اور اپنی کیفیت دل کو چھپا کر غمگین وملول ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگئیں۔

مجھے حکم ہوا کہ برہمگرہ سے میں پہلے بنگلور جاؤں پھر حیدرآباد دکن وہاں اجنتا اور ایلورا کا مطالعہ کروں اور پھر آگرہ جانے سے پہلے میں کچھ دن چھٹی لے سکتا ہوں۔ وہاں کے آثاریات کے افسروں نے میرے ٹھہرنے کا بندوبست ایک ہوٹل میں کر دیا۔ انہوں نے میرا نام دانی سنا تھا لیکن مجھے اچھی طرح جانتے نہ تھے۔ جب میں ہوٹل پہنچ کر نیچے کھانے کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سب لوگ اپنی اپنی چوکی پر الگ الگ بیٹھے ہیں۔ سامنے کھانے کے لیے ایک ایک تھال رکھا ہوا ہے۔ سب نے اپنے ہاتھ کان پر لگائے اور تھوڑا سا پانی تھال کے چاروں طرف پھیرا اور کھانا شروع کر دیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ ہونہو یہ سارے ہندو برہمن ہیں اور جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں وہ بھی برہمن کا ہوٹل ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا ہوگا پھر ایک دم خیال آیا کہ مجھے یہاں برہمن بن کر ہی رہنا ہوگا۔ میں نے اپنے آپ کو کشمیری برہمن کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ نام صرف دانی بتایا اور معذرت کی۔ ساتھ عرض کی کہ کشمیر میں ہم جنیو پہننے کے عادی نہیں

ہیں۔ ہم ایسے ہی بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ کھانے والوں نے اور بہت سے سوالات کشمیر کے متعلق کیے۔ پھر میں نے بتایا کہ میں بنارس کا طالبعلم رہ چکا ہوں۔ وہاں کے مندروں کا بھی ذکر آیا اور ساتھ ہی سنسکرت اشلوک بھی پڑھ کر سنائے۔ ان کو پختہ یقین ہوگیا کہ میں حقیقت میں کشمیری برہمن ہوں۔ جب آثاریات کے افسر میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ ہوٹل ٹھیک ہے۔ میں نے جواب دیا بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے وہاں کے سارے مندر دیکھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جہاں مسلمانوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ میں وہاں بھی گیا اور اپنے ماتھے کو لال رنگ سے خوب رچایا۔ مٹھائیاں بھی کھائیں۔ چار روز تک میں نے بنگلور کی سیر کی لیکن کسی کو میں نے شک بھی نہ ہونے دیا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہاں سے جب میں حیدرآباد پہنچا تو خواجہ محمد احمد صاحب نے میری آؤ بھگت کی۔ وہ ریاستی آثاریات کے ڈائریکٹر تھے جب میں نے انہیں بنگلور کا واقعہ سنایا تو وہ بہت ہنسے اور مجھے داد دی کہ میں نے اچھا نبھایا۔ خواجہ صاحب کو ایک واقعہ اور سنایا۔ یہ اس وقت کا تھا جب میں بنارس میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد تحقیق کے کام میں مصروف تھا۔ میرے ایک ہندو دوست شرما جی جو بسنہ گاؤں میں تھے ان کا بڑا بھائی مسٹر گوتم غازی پور میں ملازمت کرتے تھے۔ ان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا اور جب اس کا نام رکھنے کا وقت آیا تو مجھے بھی دعوت دی۔ اس نام رکھنے کی رسم کو سنسکرت میں نام کرن سنسکار کہتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے بہت سے دوستوں کو دعوت دی تھی اور ایک برہمن پجاری کو بھی دعوت دی جو ندی کے پار ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اسے اس رسم کی ادائیگی کے بلایا گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس دن اتنی بارش ہوئی کہ وہ برہمن نہیں آسکا۔ سارے مہمان پہنچ چکے تھے۔ میزبان بڑی پریشانی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ میں نے گوتم جی کو دور بلایا اور کہا کہ اگر اعتراض نہ ہو تو یہ رسم میں انجام دے سکتا ہوں اور بخوبی انجام دے سکتا ہوں کیونکہ آپ کے پاس سنتار کی کتاب سنسکرت میں موجود ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ میں مسلمان ہوں لیکن اس وقت اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم دونوں باہر آئے اور میرا تعارف کرایا کہ میں بنارس یونیورسٹی سے اس رسم میں شریک ہونے آیا ہوں لیکن یہ نہیں بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہی کہا کہ میں یہ رسم ادا کروں گا۔ میں نے بچے کو سامنے رکھ کر آگ کے سامنے پوری رسم ادا کی۔ سب خوش ہوئے اور اپنے گھر چلے گئے۔ گوتم جی نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے

ان کی لاج رکھ لی۔ خواجہ صاحب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور قہقہہ مار کر ہنسے اور میری تعریف کرنے لگے۔

حیدرآباد سے میں سیدھا بسنہ آیا۔ چند دن ابھی میری چھٹی کے باقی تھے۔ وہاں میرے دوست تھے جس کے ساتھ میرا اچھا وقت گزرتا تھا۔ یہ میرے دوست ہی نہیں بلکہ ان میں میرا ایک خالہ زاد بھائی بھی تھا، ان کا نام سعید حسن قمر تھا جس کی چھوٹی بہن کے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں۔ کس طرح میری والدہ اور ان کی والدہ نے مل کر ہم دونوں کی شادی طے کی تھی۔ شاید بچپن سے ہی یہ طے کیا گیا تھا۔ اس کا انکشاف مجھے اس وقت ہوا جب میں ناگپور میں پڑھتا تھا لیکن جیسے میں نے لکھا ہے یہ رشتہ مجھے منظور نہیں تھا۔ اس وجہ سے سعید حسن قمر صاحب کی والدہ نے اپنی لڑکی کی شادی امرتسر میں کر دی۔ ان کی ماں کو بہت گلا رہا اور وہ چاہتی تھیں کہ میری چھوٹی بہن کا رشتہ بھی ٹوٹ جائے۔

سعد حسن قمر صاحب اور ان کے دوست شرما جی ہندوستانی بحریہ میں ملازم تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ بنگال کی کھاڑی کی حفاظت کے لیے کلکتہ میں رہتے تھے۔ ایک روز جب انہیں جاپانیوں کے خلاف آگے بڑھنے کا حکم ہوا، ان کی کشتی اُن کی طرف روانہ ہوئی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی اور الٹے منہ کی کھانی پڑی۔ ان کی بھی کشتی ڈوب گئی۔ یہ دونوں دوست بچ کر کلکتہ پہنچے اور فیصلہ کیا کہ اب بحریہ کی ملازمت نہیں کرنی۔ انگریز کمانڈر کو نہیں معلوم ہو سکا کہ کتنے آدمی مر گئے اور کتنے بچے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ دونوں بھی مر گئے ہیں اور اس کی اطلاع ان کے والدین کو امرتسر میں کر دی گئی۔ یہ دونوں چھپتے چھپاتے بسنہ پہنچے اور ہمارے گھر میں پناہ لی۔ مجھے یہ قصہ سنایا اور میرے والد صاحب کو بھی سنایا۔ بہتر ہم لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ وہیں چھپ کر اپنا وقت گزاریں۔ یہ 1942ء کا واقعہ تھا۔ اس دوران وہ چھپ کر ایک آدھ مرتبہ امرتسر بھی گئے۔ ان کے والدین کو معلوم ہو گیا کہ وہ زندہ ہیں لیکن ان کے لیے امرتسر میں رہنا مشکل تھا۔ انہوں نے بسنہ میں ہی تجارت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ دونوں دوست مل کر سعید شرما کے نام سے ایک دکان چلانے لگے۔ میرے والد نے ان کو رہنے کی جگہ دی اور دکان کے لیے ساتھ ہی ایک کمرہ بھی دے دیا۔ یہ کشمیر بھی جانے لگے اور وہاں سے دستکاری کا سامان لے کر بسنہ میں فروخت کرنے لگے۔

اس طرح وہاں کئی سال گزر گئے۔

جب کبھی میں بسنہ جاتا ہم ایک دوسرے سے مذاق کرتے اور شادی بیاہ کی بات کرتے۔ میں نے شرما جی کو بتایا کہ کیسے بچپن میں ہماری شادی کی بات چلی تھی لیکن میرا رشتہ طے نہیں ہوسکا اور سعد حسن قمر کی بہن کی شادی دوسری جگہ ہوگئی مگر میری بہن ابھی تک گھر میں بیٹھی ہے اور تمہارا دوست بھی ابھی تک کنوارا ہے۔ اب کی دفعہ 1946ء کے شروع میں جب حیدر آباد سے بسنہ آیا تو کھل کر دونوں سے میری بات ہوئی اور انہیں قائل کرلیا کہ سعید حسن قمر کی شادی میری بہن زاہدہ بیگم سے ہو ہی جانی چاہیے تا کہ وہ پوری طرح سے بسنہ میں رہ سکیں اور اپنی تجارت کو فروغ دے سکیں۔ سعید حسن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے والدین اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ اب تم امرتسر بھی نہیں جاسکتے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں ہمیشہ کے لیے رہ جاؤ اور میں والد صاحب سے بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی بیٹی زاہدہ بیگم کا سارا زرعی حصہ شادی کے وقت ہی اسے دے دیں اور تم کو بھی کچھ رقم دے دی جائے تا کہ تم اپنی تجارت بڑھا سکو۔ ان دونوں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو سعید حسن ضرور شادی پر تیار ہیں۔

ان سے یہ بات پکی کرنے کے بعد میں اپنے والد صاحب کے پاس گیا اور انہیں مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان شرائط کو قبول کرلیں۔ پہلے تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہوئے اور مجھ سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا جنہیں اپنی بیٹی کی شادی کی بہت فکر تھی۔ وہ ناراض ہوگئیں لیکن مسلم گھرانے میں عورتوں کی سنتا کون ہے۔ پھر میں نے اپنے بڑے بھائی غلام مرتضیٰ دانی سے کہا اور دوسرے چچاؤں سے بھی ذکر کیا ور والد صاحب کو منانے کی کوشش کی۔ میرے والد صاحب سب کی سنتے اور سوچتے لیکن پوری طرح سے قائل نہیں ہوتے۔ ان کو اپنی جدی زمین سے محبت تھی۔ ایک دن میں نے انہیں آخری شرط دی کہ اگر وہ نہیں مانیں گے تو میں ہمیشہ کے لیے بسنہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور کبھی انہیں منہ نہ دکھاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں نے اپنا سامان لیا اور بس پر اس خیال سے سوار ہوگیا کہ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ اب میں بسنہ کبھی نہیں آؤں گا۔ میری ماں رونے لگیں، بہنوں نے شور مچایا، بھائی پیچھے دوڑ کر آیا، چچا پیچھے بھاگے، گاؤں والوں نے بس کو روک لیا۔ میں اپنی بات پر اڑا بس میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں خراماں خراماں والد صاحب بھی

بس کے قریب آ گئے اور مجھے کہا کہ اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے۔ اب اتر بھی آؤ۔ میرے دونوں دوست سعید اور شرما بھی آ گئے اور مجھے بتایا کہ میرے والد صاحب نے میری بات کو مان لیا ہے۔ میں اس یقین دہانی پر بس سے اتر آیا اور میں نے کہا کہ میرے ہوتے یہ نیک کام ہو جانا چاہیے۔ اب پھر اڑے، کہا کہ اتنی جلدی یہ کیسے ممکن ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر شرائط منظور ہیں تو پھر کس بات کی دیر۔ غرض کہ میری بہن زاہدہ بیگم کی شادی ہو گئی۔ سعید حسن قمر صاحب ہمیشہ کے لیے اپنی جائیداد کی خاطر بسنہ میں ہی رہ گئے۔ میں بہت خوش ہوا اور اس شادی میں بہت کام کیا۔ شادی کے دوران جب کھانا کھلایا جا رہا تھا میں باورچی خانہ سے پلیٹیں بھر بھر کر باہر لے جا رہا تھا۔ ہماری ساری بہنیں وہاں کام کر رہی تھیں۔ جب ایک دفعہ میں اندر گھسا تو وہاں صرف ایک لڑکی دیگ سے کھانا نکال رہی تھی۔ وہ کون تھی، وہ تھی صفیہ سلطانہ میرے چچا محمد سکندر دانی کی لڑکی، جس کے ساتھ میں نے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن بات وہیں کی وہیں رہ گئی تھی کسی طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی اور میں خود دہلی میں ایک دوسری لڑکی کے چکر میں الجھ گیا تھا۔ میں اندر جا کر سہم گیا اور وہ شرم کے مارے ایکدم باہر نکل گئی۔ اس سے میں کوئی بات بھی نہ کر سکا اور دل کافی دیر تک دھک دھک کرتا رہا۔ شادی سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے واپس آگرہ چلا گیا۔ ابھی چند ماہ آگرہ میں گزرے تھے، ڈائریکٹر جنرل نے عمارتی حفاظت کا کورس شروع کرایا جس میں شرکت کے لیے مجھے بھی بلوایا گیا۔ یہ کورس ڈاکٹر انصاری کی زیرِ نگرانی ہونا تھا۔ میں اور میرے ایک دوست ایم این دیشپانڈے ہمارے اپنے دوست ایس اے نقوی صاحب کے گھر پر ٹھہرے۔ وہ دونوں بہاولپور ہاؤس کے احاطے میں ایک مکان میں رہتے تھے۔ دیشپانڈے صاحب بعد میں بھارت کے آثاریات محکمہ کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر انصاری صاحب کو بھی اسی بہاولپور ہاؤس میں دوسرا مکان ملا تھا جو نقوی صاحب کی رہائش گاہ کے قریب تھا۔ جب ہم یہ تربیتی کورس کر رہے تھے تو بہت سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مجھے پسند کرتے ہیں۔ میں نے دیشپانڈے صاحب کو ان کی لڑکی کے متعلق بتایا۔ وہ اور نقوی صاحب دونوں مجھ سے مذاق کرتے۔ کئی دفعہ ڈاکٹر انصاری نے ہمیں اپنی فیملی کے ساتھ ہوٹل میں کھانے پر دعوت دی۔ وہاں

ان کی لڑکی سے ملاقات ہو جاتی تھی لیکن ان کی بیگم تھوڑا ملنے سے کتراتی تھیں۔ میں نے طے کیا کہ اس کا فیصلہ اب ہو ہی جانا چاہیے۔ میں نے دیشپانڈے سے کہا کہ 20 جون 1947ء کو میرا پیدائش کا دن ہے۔ کیوں نہ اس روز سب کو دعوت دی جائے۔ بات پکی ہو گئی۔ نقوی صاحب کے گھر میں ہی اس دن کو منانے کا اہتمام کیا گیا۔ ایک کیک تیار کیا گیا اور بیٹھنے کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ میں اور ڈاکٹر انصاری کی لڑکی ساتھ ساتھ بیٹھیں گے اور ساتھ ہی کیک کاٹیں گے۔ میرے ساتھ دیشپانڈے صاحب، ہمارے سامنے ڈاکٹر انصاری اور ان کی بیگم اور نقوی صاحب اور دوسرے کنارے بچے بیٹھیں گے۔ شام ہوئی، وقت ہو گیا۔ ہم سب انتظار کرتے رہے۔ انتظام دیکھ کر مسکرائے اور خوش ہوئے۔ چونکہ بات وہ سمجھ گئے تھے۔ اب ان کی بیگم اور لڑکی آئیں۔ انتظام بیگم کو اچھا نہیں لگا۔ وہ خود میرے ساتھ بیٹھ گئیں۔ ایک لڑکی کو ساتھ بٹھایا اور لڑکی کو دور کنارے پر بیٹھنے کو کہا۔ ہمارا سارا منصوبہ دھرے کا دھرہ رہ گیا۔ سوچا کچھ تھا ہو کچھ گیا۔ کیک بھی کٹا، کھایا بھی گیا، چائے بھی پی، سب کچھ ہوا اور سب چلے بھی گئے۔ میں اور دیشپانڈے اس نتیجے پر پہنچے کہ بات نہیں بنی۔ باپ کی مرضی کا اندازہ ہو گیا کہ وہ راضی ہیں لیکن ماں کا برتاؤ اور طور طریقے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت ہی مغرور اور نک چڑھی ہیں اور وہ اس سے خوش بھی نہیں۔ دوسرے دن ڈاکٹر انصاری نے اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ میں اور دیشپانڈے دور شیر شاہ کے پرانے قلعہ چلے گئے۔ شام کو کافی دیر سے واپس لوٹے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ہمارے منتظر تھے۔ ان کے اسرار پر ہم ان کے گھر چلے تو گئے لیکن ہم دونوں نے پرانے قلعہ میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ رشتہ موزوں نہیں ہوگا۔ ہم نے اپنے اس عشق کی روداد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس پرانے قلعہ میں دفن کر دیا۔ دوسرے دن کی چائے پر جو ہم نے برتاؤ کیا تھا وہ بھی نہ ہی دکھانے کے لیے کیا تھا کہ اب پچھتائے کیا ہووت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ڈاکٹر انصاری نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میری آخری ملاقات ڈاکٹر انصاری سے کراچی میں 1949ء میں ہوئی۔ انہوں نے پھر شادی کی بات چھیڑی۔ میں نے جواب دیا کہ میری شادی میرے چچا کی لڑکی صفیہ سلطانہ سے ہو چکی ہے۔ وہ یہ سن کر بہت اداس ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

ہندوستان میں خانہ جنگی اور پاکستان کا قیام

ڈاکٹر انصاری اور ان کی لڑکی میرے دل و دماغ سے خارج ہو گئے لیکن میری شادی کے مرحلے طے ہونے میں ابھی بہت وقت تھا لیکن اب صفیہ سلطانہ کی یاد شدت اختیار کر چکی تھی لیکن میں دہلی میں تھا اور وہ بسنہ میں۔ اس دوری کے علاوہ ملک میں ایک سیاسی طوفان چھایا ہوا تھا جس کی لپیٹ میں ہم سب آ گئے۔ میں، میرے گاؤں بسنہ میں رہنے والے اور میرے رشتہ دار جو امرتسر میں رہے تھے سب تتر بتر ہو گئے تھے۔ اور جب تک ہم سب یکجا نہ ہوں، یہ قافلہ کسی ٹھکانے پر نہ پہنچے اس وقت تک شادی کیسے ہو سکتی تھی۔

ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کا سلسلہ تو کئی سالوں سے چل رہا تھا لیکن محرم کے موقع پر جب تعزیے نکلیں تو جھگڑا، عیدالضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی پر جھگڑا، کبھی ہولی یا دیوالی پر اور کبھی مسجد کے سامنے باجا بجانے پر ہنگامہ ہو جاتا تھا لیکن یہ سب علامتی جھگڑے تھے۔ اصلی وجہ بڑی گہری تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد صاف ظاہر تھا کہ انگریز کا ہندوستان کو اپنی شہنشاہیت کے زیر اثر رکھنا اب ممکن نہیں۔ ان خیالات کا اظہار 1942ء میں ہی انگلینڈ کی لیبر پارٹی نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد جب لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی تو اس ملک کی اقتصادی حالت اتنی گر چکی تھی کہ محکوم ملکوں کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اسی لیے 1942ء میں گاندھی جی نے ہند ترک کرو کی مہم چلائی تھی۔ اب صاف ظاہر تھا کہ ہندوستان جلد از جلد آزاد ہو جائے گا لیکن سیاسی طاقت کو منتقل کرنے کا کوئی آسان طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر یہاں کے لوگوں کی آزادی کا دینا ہے تو سب کو دینا ہے تاکہ کسی پر ناانصافی نہ ہو اور طریقہ کار بھی ایسا ہو کہ یہ کام قانون کی حدود میں رہ کر سرانجام دیا جا سکے۔ قانون امن جاری رہے۔ بات اب صرف انگریزوں سے جنگ کی نہیں رہی۔ انگریز تو جانا چاہتے ہیں لیکن وہ جائیں کیسے۔ اپنے تسلط سے کس طرح دست بردار ہوں۔ ہندوستان سے جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یہاں سے بالکل ہی قطعہ تعلق کرنا چاہتے تھے۔ جاتے ہوئے ان کی مرضی یہ بھی تھی کہ ہندوستان اور دیگر محکوم ممالک کو جن کو آزادی ملنی تھی ان سب کو ایک نئے نظام میں ڈھالنے کی ضرورت تھی۔ برٹش سلطنت کی جگہ اب آزاد ملکوں کی

دولت مشترکہ بنانے کا خیال تھا۔ انگریزوں کا مقصد صاف ظاہر تھا لیکن یہاں کے رہنے والوں میں آپس میں کوئی اتفاق نہیں تھا۔ یہاں کے لوگوں میں اب آپس میں اپنی جنگ ہو رہی تھی جو انگریزوں نے اپنے انتظامی دائرے میں شروع کروائی تھی۔ یہ تھی سیاسی جنگ جو زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے تھی۔ اگر کوئی اس وقت کے اخبار سٹیٹس مین کو پڑھے تو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح اس میں اور دوسرے اخباروں میں انگریزوں کے علاوہ تین طاقتوں کا ذکر آتا تھا اور وہ تھا ہندو، مسلم اور سکھ۔ یہ نشاندہی کر رہے تھے اس کی طاقتوں کی اور ان کے آپس میں ٹکراؤ کا۔ اب اگر انہیں ہم ہندو اور مسلم کے تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں تو بات سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ ٹکراؤ کس طرح ہندو اور مسلمانوں میں شدت اختیار کر گیا۔ ابھی تک اس ٹکراؤ کو ہم ہندو مسلم فرقہ وارانہ فساد سمجھتے رہے۔ اب وہ فرقہ وارانہ تصادم نہیں رہا بلکہ اب ہندوستان میں رہنے والی دو قوموں کے درمیان خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بدقسمتی سے یہ تاریخی پس منظر بہت کم لوگوں کے دماغ میں ظاہر ہوا۔ ہم ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں قاصر رہے، جس کا بہت بڑا اثر عام لوگوں کی زندگی اور مستقبل کی راہ پر ہوا۔ قوموں میں دشمنی بڑھتی گئی اور جب سیاسی رنگ ان پر چھا گیا تو فساد کو دور کرنے کا مقصد آپس میں مل جل کر امن سے رہنے کا نہیں بلکہ ان قوموں کے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا ہو گیا۔ وہ محدود تصادم اب بہت دور نکل گیا۔ یہ تھی ابتدا ہندوستان میں خانہ جنگی کی۔

ابھی خانہ جنگی نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا کہ سیاسی سیاہ دن منانے کا موقع ساتھ آیا۔ اس سے جوش و خروش میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس سے بھی پہلے دوسرے عام انتخاب کا زمانہ آیا۔ مسلمانوں نے کھل کر مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیا اور انہیں کامیاب کیا لیکن صرف ایک صوبہ سرحد ایسا تھا وہاں پر مسلم لیگ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کانگرس کے ارکان کی تعداد کافی زیادہ رہی جن کی رہنمائی اس وقت خان برادرز (ڈاکٹر خان اور خان عبدالغفار خان) کرتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے یہاں سیاست کے میدان میں بہت کام کیا تھا اور کانگرس کی جماعت کو مضبوط کرنے میں اور مقبول عام بنانے میں ساری عمر صرف کر دی۔ سرحد کا سیاسی معاملہ اور قسم کا تھا وہاں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں تھے اور پشتونوں کی زندگی میں یہ تصور

عام تھا کہ انہیں ہندوؤں سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کے لیے سیاست اجتماعی زندگی کا ایک مظہر تھا۔ چونکہ کانگرس نے وہاں زیادہ منظم طور سے کام کیا۔ اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کی شروعات یہاں بہت بعد میں ہوئی۔ اس کا نظم ونسق اس صوبہ میں اتنا زور نہیں پکڑ پایا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگوں میں اسلام کا جوش نہیں تھا اور وہ مسلمان ریاست سے بیگانہ تھے۔ بعد میں جب پاکستان کے نام پر عام رائے شماری ہوئی تو اس وقت خان برادرز کی قربانیاں کام نہیں آئیں اور لوگوں نے پاکستان کے لیے ووٹ دیئے۔ صرف یہی نہیں بعد میں جب خانہ جنگی کا دور دورہ ہوا یہاں بھی ہندوؤں پر مصیبت پڑی اور وہ بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ مسلمانی ریاست کا نام اتنا مقبول ہوا کہ قبائلی علاقہ کے وہ لوگ جنہوں نے انگریزوں کو کبھی قبول نہیں کیا تھا اور ہمیشہ ان سے لڑتے رہے اب پاکستان کا ساتھ دینے کے لیے خود تیار ہوئے اور وہاں لڑائی کی عام فضا ختم ہوگئی۔

خانہ جنگی کی شکل وصورت برصغیر میں بالکل ہی مختلف تھی۔ ایک خاکہ میں نے اوپر جاٹوں اور میوں کی لڑائی کا پیش کیا ہے۔ دراصل یہ خانہ جنگی ہندو مسلم فساد سے شروع ہوئی تھی اور دونوں ہی ایک دوسرے کا نام ونشان مٹانا چاہتے تھے۔ دوسری قوم کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جوش و ولولہ کا یہ عالم تھا کہ انسانیت کے تقاضے پس پشت ڈال دیئے تھے۔ وحشی درندے سے زیادہ وحشت ناک ہو چکے تھے۔ بہار میں مسلمانوں کا جو قتل عام کیا وہ ان کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ننگی عورتوں کو سڑکوں پر چلانا، ان کے مخصوص اعضا کاٹ کر پھینک دینا، بچوں کے ہاتھ پیر کاٹ کر اچھال دینا وغیرہ اس کی کسی انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی یہ وہ حرکات تھیں جو وحشی اور سنگدل ہی کرسکتا ہے۔ پنجاب میں بھی اس طرح کے قتل وغارت کے نمونے ملتے ہیں چونکہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہی عید ہونا تھی۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان بری حالت میں بھاگ بھاگ کر پاکستان آرہے تھے۔ ان میں کچھ قافلے ریل، کچھ بسوں کے اندر اور چھت پر سوار تھے اور کچھ لوگ پیدل بھی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کیا کبھی یہ بھی انسان سوچ سکتا ہے کہ ریل کے ایک ڈبے میں عورتوں کے مخصوص اعضاء کاٹ کر بھرے جائیں اور ڈبے کے باہر لکھا ہو کہ پاکستان کا یہ عید کا تحفہ ہے۔ یہ انسانی اخلاق نہیں بلکہ یہ وحشیانہ حرکت کا نہ بھولنے والا

ایک منہ بولتا نمونہ ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دو قوموں کی لڑائی لاہور، راولپنڈی اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی ہوئی جو حال مسلمانوں کا پٹیالہ اور کپورتھلہ میں ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ کوئی مسلمان مشرقی پنجاب میں رہ سکے اور کوئی ہندو اور سکھ مغربی پنجاب میں بچ سکے۔ یہاں کل آبادی کا تبادلہ ہی ان کو نئی زندگی دے سکتا تھا اور آخر وہی ہوا۔ یہ تبادلہ امن وامان کے ذریعہ بھی ہوسکتا تھا اور اگر اس کے لیے لڑائی ہی لڑنی تھی تو دائرہ اخلاق میں رہ کر بھی لڑی جا سکتی تھی۔ اس کے لیے ضروری نہ تھا کہ انسانی حدود سے تجاوز کیا جائے لیکن یہاں انسان انسانیت سے خارج ہو کر وحشی درندہ بن گیا تھا' جنگ کا بھی اپنا ایک ضابطہ اخلاق ہوتا ہے لیکن اس خانہ جنگی میں کوئی ضابطہ اخلاق نہیں تھا جبکہ وحشت' بربریت ہی اس کا ضابطہ اخلاق تھا۔ عام لوگ انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر وحشی بن چکے تھے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ انسان فرداً اور اجتماعی طور پر یکساں تھا۔ فرداً فرداً انسان پھر بھی انسان تھا اور اس کی بہت سی مثالیں اس وقت بھی دیکھنے میں آئیں لیکن اجتماعی طور پر انسانیت مکمل خارج ہو چکی تھی۔ یہ کسی ایک فرد کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ قوموں کے تحفظ اور قومی زندگی کی بقا کا مسئلہ تھا اور یہی بنیاد تھی دو قومیت کے اصول کو اپنانے کی۔ اگر مسلمان کو زندہ رہنا تھا تو وہ صرف مسلم قومیت کے سہارے زندہ رہ سکتا تھا اور یہی مسلمانوں کا قومی نعرہ بن گیا۔

اس قسم کی خانہ جنگی نہ صرف مشرقی پنجاب اور مغربی پاکستان میں ہوئی بلکہ اس برصغیر کے ہر اس علاقہ میں ہوئی جہاں مسلمانوں کی خاص آبادی تھی۔ اسی طرح بنگال' لواکھلی' ڈھاکہ' کلکتہ اور دیگر علاقوں میں ہوئی۔ بھارت میں یہ جنگ اب تک جاری ہے اور اسے فرقہ وارانہ فساد ہی سمجھا جاتا ہے۔ کم از کم 1947ء کے قریب جب انگریزوں سے آزادی ملنے والی تھی اس کا یہ رنگ نہ تھا۔ دراصل خانہ جنگی تھی لیکن نتیجہ برصغیر کے دوسرے خطوں میں اور نکلا۔ مسلمانوں کی یا ہندوؤں کی بھاری اکثریت کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہیں ملک سے باہر بھی نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اقلیت کی حیثیت اختیار کر کے وہیں آباد ہو جائیں اور اکثریت سے اپنا امن وامن کا تعلق قائم کریں۔ یہی انسانیت کا تقاضا اور یہی انسانی اقتدار کی ضمانت تھی۔ اسی میں بھارت اور پاکستان کی بقا تھی اور یہی اصول ان دو ملکوں کو امن کی راہ پر

گامزن کر سکتے تھے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اپنا اجتماعی تنازع ختم کر کے انسانی پرچم کے تلے جمع ہوں اور ایک دوسرے کی قومیت اور ملکی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے عام آدمیوں کی بقا اور ترقی کی طرف متوجہ ہوں۔

برصغیر کی اس بدلتی ہوئی حالت میں میرے خاندان کے لوگ بھی آ گھرے اور میں اس سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ جب وقت آیا میں نے بھی پاکستان جانے کے لیے لکھ کر اپنی مرضی ظاہر کی۔ امید یہ تھی کہ میرے جانے سے بسنہ میں رہنے والے میرے خاندان کے لوگوں کو پناہ کی جگہ میسر آ جائے گی اور وہ سب پاکستان منتقل ہو جائیں گے۔ امرتسر کے رشتہ داروں سے تعلقات قائم رہیں گے اور میری بہنیں جو وہاں بیاہی گئی ہیں ان کا بھی ہم سے میل ملاپ رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ ہم سب اکٹھے پاکستان میں کسی جگہ آباد ہو جائیں۔ میں اس وقت دہلی میں تھا۔ میرے دوستوں کو یہ معلوم تھا کہ میں پاکستان جانے والا ہوں۔

ان میں سے کچھ ہندو دوست میرے پاس آئے اور ہمارے مشترکہ کشمیری دوست ترلوکی ناتھ کھجانچی کا مسئلہ بیان کیا۔ کھجانچی صاحب اس وقت کشمیر سٹیٹ آثاریات میں ملازمت کرتے تھے۔ مجھ سے یہ اصرار کیا گیا کہ ہم ایک دوسرے کی جگہ قبول کر لیں۔ اس طرح میں کشمیر چلا جاؤں اور وہ دہلی آ جائیں۔ اس میں نہ صرف انسانی ہمدردی کا سوال تھا بلکہ میری اپنی دیرینہ خواہش بھی پوری ہو جاتی۔ دہلی میں ہم سب کو یہی یقین تھا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جائے گا۔ اس طرح میرے پاکستان جانے کا مقصد بھی حل ہو جائے گا۔ ہم نے آپس میں طے تو کر لیا لیکن قانونی لحاظ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ میری ملازمت انگریزی ہند سرکار کے ماتحت تھی اور کھجانچی صاحب کشمیر سٹیٹ کے ملازم تھے لیکن جب کشمیر پاکستان میں شامل نہیں ہوا تو ہم سب کو بہت حیرانگی ہوئی۔ یہ ہمیں معلوم تھا کہ وہاں کا مہاراجہ ڈوگرا ہے لیکن اس کی رعایا تو اکثریت میں کشمیری ہیں اور ان میں مسلمان اکثریت سے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کبھی ہندو مسلم فساد بھی نہیں ہوا۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر کشمیر کے مہاراجہ بہادر بھارت میں شمولیت کی خواہش بھی کریں تو اس وقت کے بھارتی سیاست دان اسے کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔ ان سیاست والوں میں جواہر لال نہرو جمہوریت کے قائل تھے اور وہ مہاراجہ کی بات ماننے کو کبھی تیار نہیں تھے۔ وہ جمہور کی

آواز کے ہمیشہ قائل رہے ہیں۔ ان سب پہلوؤں کو دیکھ کر یہ یقین تھا کہ کشمیر پاکستان کے ساتھ ہی شامل ہوگا۔

اس کے باوجود کشمیر کا معاملہ کیوں حل نہیں ہوا' کیا اس میں انگریزوں کے نمائندہ وائسرائے لارڈ لوئی ماؤن بیٹن کا ہاتھ تھا۔ شاید یہ بھی ممکن ہے لیکن کیا بھارت کے سیاست دان اس بات کو نہیں سمجھتے تھے کہ اگر کشمیر پاکستان میں شامل نہ ہو تو بھارت اور پاکستان کا تنازع کم نہیں بلکہ بڑھتا ہی جائے گا۔ اس سے تقسیم برصغیر سے جو فائدہ قوموں کو اٹھانا تھا وہ نہیں ہو سکے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھارت یا پاکستان کے اس وقت کے سیاست دان اس معمولی بات کو نہیں سمجھے لیکن مسئلہ صرف کشمیر کا نہیں تھا۔ اس وقت برصغیر میں جتنی خودمختار ریاستیں تھیں ان سب کا تھا۔ کانگرس کی یہ بہت پہلے منشا تھی کہ ان ریاستوں کو ختم کر کے انہیں ملکی عام حکومت کے ساتھ مدغم کرنا ہے۔ اسی حکمت عملی پر ان کے مشہور سیاست دان ولبھ بھائی پٹیل نے کام کیا اور بھارت میں ساری ریاستوں کو شامل کر لیا۔ شاید اسی پالیسی کے اس وقت کے مسلم سیاست دان حامل نہیں تھے۔ اسی لیے جونا گڑھ اور مانواداکا مسئلہ کھڑا ہا۔ بھارت کے بہت سے مورخ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ پٹیل صاحب نے یہ کہا کہ وہ کشمیر سے ہاتھ الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر پاکستان ان کے ریاستی معاملوں میں دخل نہ دے۔ خاص کر حیدرآباد کے معاملے میں۔ اس میں سچائی کہاں تک ہے' یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پاکستان کے سیاست دانوں نے اس وقت حیدرآباد دکن کے نظام اور وہاں کے مسلم لوگوں کے ساتھ حد سے زیادہ ہمدردی ظاہر کی تھی۔ کیا اس دخل اندازی نے بھارت کے سیاست دانوں کا دماغ پھیر دیا اور انہوں نے کشمیر پر آنکھ لگانی شروع کر دی۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں جواہر لال نہرو صاحب کا اپنا جذباتی خیال بھی شامل ہو کیونکہ وہ خود کشمیری تھے۔ بہر حال اگر ہم اس وسیع پس منظر سے کشمیر کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کریں تو تاریخی واقعات روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کشمیری عوام کے حقوق کو سرے سے ملیامیٹ کیا جائے۔ میرے خیال سے اس بات پر پوری توجہ دینے کی کوشش جواہر لال نہرو نے کی لیکن وہ صرف اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے کانگرسی دوست شیخ عبداللہ کو ترجیح دی۔ انہیں جیل سے آزاد کیا اور یہی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کشمیر کے نمائندہ

ہیں۔اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان والوں نے بھارت کو قبول کیا۔کیا شیخ عبداللہ کی مقبولیت کشمیر میں ویسی تھی جیسے سرحد میں خان برادرس کی تھی۔ یہ معاملہ بحث کے قابل ہے کیونکہ کشمیر میں دوسری جماعت مسلم کانفرنس کی بھی تھی۔اگر یہ بھی مان لیں کہ شیخ صاحب کی مقبولیت عوام میں بہت زیادہ تھی تو بھی اگر رائے شماری کشمیر میں ہوتی تو عوام پاکستان کے لیے ووٹ دیتے جیسے سرحد کے عوام نے خان برادرس کی قربانی اور محبت کے باوجود پاکستان کے لیے ووٹ دیا۔میرے خیال میں یہ بات جواہرلال نہرو کو اچھی طرح معلوم تھی اور شاید اسی لیے بھارت کے مورخ لکھتے ہیں کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونے کی پیشکش کی گئی تھی۔ یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ کشمیری عوام کو حق خودارادیت کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔کشمیری عوام بھارت اور پاکستان کی جنگوں کا شکار ہوتے رہے اور بستے رہے۔

بعدازاں جو کچھ کشمیر میں ہوتا رہا وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔خواہ آپ اقوام متحدہ کے ادارے میں جا کر فیصلہ کروائیں یا آپس میں فیصلہ کریں۔کشمیر کی قسمت کا مسئلہ کشمیریوں کے علاوہ کوئی کرے یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔اس کا فیصلہ خود کشمیر کے عوام ہی کر سکتے ہیں۔ان کی قسمت کا فیصلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔

اس کے باوجود کشمیر کا معاملہ حل کیوں نہیں ہوا اور بھارت کو اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ کشمیر کو وہ اپنا اٹوٹ انگ سمجھنے کے قابل بن گیا۔یہ ایک طویل داستان ہے جس میں خود پاکستان کی اپنی بین الاقوامی حکمت عملی کی ناکامیابی بھی شامل ہے۔میرے خیال میں ہمارے وزیرخارجہ مشہور قانون دان رہے ہیں لیکن خارجہ حکمت عملی کے میدان میں بہت کم کامیاب رہے ہیں۔ قانونی فتح اور خارجہ حکمت عملی دو متضاد چیزیں ہیں۔کشمیر بھارت اور پاکستان کے اسی تنازع کا شکار رہا ہے اور کشمیری عوام ابھی تک اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔شاید دنیا کے اجاگر جمہوریت پسند عوام الناس ان قسمت کے مارے کشمیریوں کو بھی اپنے حق حاصل کرنے میں مدد دیں اور وہ بھی اس آزادی کی نعمت سے آشنا ہو سکیں جس کا وہ ایک مدت سے خواب دیکھ رہے ہیں۔

جب میرا کشمیر جانا نہیں ہوا تو میں پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔میں دہلی میں ہی

تھا کہ میرے بڑے بھائی غلام مرتضیٰ دانی بسنہ سے میرے پاس آئے اور بتایا کہ گھر میں یہی فیصلہ ہوا ہے کہ ہم سب دھیرے دھیرے کراچی چلے جائیں جہاں مجھے جلد جانا ہوگا۔ میرے وہاں چلے جانے سے ایک گھر مل جائے گا اور ہم سب کو تقویت حاصل ہوگی۔ مجھے اس کا پہلے علم نہیں تھا۔ سن کر بڑا خوش ہوا کہ میرے والدین بھی پاکستان آجائیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے بڑے بھائی صاحب کو پہلے کراچی بھیجنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ بھائی صاحب اپنے ساتھ کافی رقم لے کر بھی آئے تھے۔ انہیں تجارت کا بہت تجربہ تھا۔ امید تھی کہ کراچی جا کر وہ کوئی نہ کوئی تجارت شروع کرلیں گے۔ چونکہ ہندوستان میں بھی وہ گجراتی میمنوں کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے انہیں کے ساتھ مل کر یہاں کام کرنے کا ارادہ تھا۔ ہم دونوں اس پر راضی ہوگئے اور یہی طے پایا کہ جلد از جلد وہ کراچی کے لیے روانہ ہوجائیں۔ پھر سوچا کہ وہ اکیلے سفر نہ کریں کیونکہ ان دنوں ہندو مسلم خانہ جنگی کی فضا بہت خراب ہوچکی تھی۔ طے یہی ہوا کہ ہم دونوں پہلے امرتسر جائیں اور وہاں رشتہ داروں سے ملیں اور اگر ہوسکے تو ان کو بھی وہاں سے نکال کر ساتھ لے جائیں۔

11 اگست 1947ء کو ہم روانہ ہوئے۔ رات کی ریل گاڑی سے دو سیٹیں ریزور کرالی تھیں۔ جب ڈبہ میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں نشستیں دو سکھوں نے محفوظ کرالی ہیں۔ ڈبہ میں ہم چاروں گھس تو گئے لیکن رات بھر کوئی بھی سو نہ سکا۔ خطرہ تھا کہ اگر ہم سوئیں تو شاید سکھ ہم دونوں کو قتل نہ کردیں اور انہیں ہماری طرف سے خطرہ تھا۔ اس قسم کی وارداتیں اس وقت ریل گاڑیوں میں عام ہورہی تھیں۔ خیر رات گزر گئی صبح صبح ہم امرتسر پہنچ گئے۔ اترتے ہی ہم دو کیمپوں میں چلے گئے۔ ایک مسلمان کا اور دوسرا ہندو سکھوں کا۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ شہر جانے کی اجازت ہوگی کسی محلّہ میں تو ہم جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ پورے شہر میں کرفیو ہے۔ اس کے باوجود دونوں قوموں میں لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے مہاسنگ کٹڑے کا حال پوچھا معلوم ہوا کہ اسی دن وہاں دو قومی دلوں میں تلوار کی لڑائی ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ چٹے کٹڑے کا حال پوچھا پتہ چلا کہ وہاں تو دلبندی بڑے زور کی ہے کیونکہ دونوں قوموں نے وہاں بڑی تیاری کرلی ہے۔ وہاں میرے بڑے بہن کے خاوند عبداللطیف اور ان کے بچے رہتے تھے۔ مہاسنگا کٹڑے میں ہماری بوڑھی پھوپھی، ان کے خاوند حکیم محمد جان اور ان کے بچے تھے اور بھی رشتہ دار

دوسرے محلوں میں تھے۔ ہماری دو چاچی زینب بیگم جو غلام جیلانی دانی کی بیوی تھیں اور دوسری اقبال بیگم جو محمد سکندر دانی کی بیوی تھیں ابھی چند ماہ بیشتر امرتسر بسنہ سے آئیں تھیں۔ ان کا ٹھکانہ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ان سب رشتہ داروں کو دور سے خیر باد کہہ کر ہم دونوں بھائی لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے بڑے بھائی صاحب کو ریل میں کراچی کے لیے روانہ کر دیا اور ان سے کہا کہ 14 اگست کے قریب میں بھی کراچی پہنچ جاؤں گا اور وہاں ملاقات ہو گی۔ میں نے دوسری گاڑی پکڑی اور دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

یہ 12 اگست کی بات ہے، رات ہو چکی تھی۔ ریل انبالہ پہنچنے والی تھی۔ یکا یک ریل رک گئی، شور مچ گیا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کہ سکھ تلواریں لے کر ڈبوں میں گھس آئے ہیں۔ مسلمانوں کی خیر نہیں۔ میں نے چپکے سے دروازہ کھولا اور سارا سامان ڈبے میں ہی چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ رات کی تاریکی میں اکیلے باہر نکل گیا۔ پیچھے سے چیخ و پکار کی آوازیں آتی رہیں۔ بچاؤ، بچاؤ، یہ مردوں اور بچوں کو مار رہے ہیں اور ہم عورتوں کو کھینچ کر لیے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھو ایک جوان عورت لڑنے کو تیار ہے۔ قتل ہوئی اور وہ ماری گئی۔ وہ ایک ہندو کوچوان تھا۔ اس کے سامنے مسلمانوں کو خوب برا کہا کوسا اور کہا کہ یہ رحم کے قابل کسی طرح نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔ اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے میں نے اس کوچوان سے کہا کہ مجھے انبالہ میں ایک ہندو دوست اگروال جی کے گھر جانا ہے۔ یہ اگروال جی بنارس کے ایک میرے ہم درسی رتن چندر اگروال کے والد تھے۔ ان کے گھر میں پہلے جا چکا تھا۔ میں نے کوچوان سے کہا کہ اگر تم مجھے وہاں پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہو گی۔ کوچوان نے کہا کہ انبالہ یہاں سے پانچ میل ہے۔ میں ادھر جا تو رہا ہوں لیکن سٹیشن تک چھوڑ سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ چلو وہیں چھوڑ دو۔ راستے میں ہم نے ہندو مسلم لڑائیوں کی بڑی باتیں کیں۔ اب صبح ہو چکی تھی۔ سٹیشن پہنچ کر میں اتر گیا اور دہلی کی ٹکٹ خرید کر سیدھا اندر گھس گیا۔ سامنے ایک فوجی مخصوص ٹرین کھڑی تھی۔ ہمت کر کے میں آگے بڑھا اور سیدھا فوجیوں کے کمانڈر کے ڈبہ میں آ گھسا۔ اس وقت میں خاکی قمیض اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ لوگ مجھے بھی فوجی ہی سمجھے۔ اندر آنے کی اجازت مانگی۔ ایک انگریز کرنل سامنے بیٹھا تھا۔ میری شناخت پوچھی۔ میں نے اپنا سارا قصہ سنایا اور مجھے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کیا۔ رحم

کھا کر اس نے مجھے ایک ڈبے میں جانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح میں 13 اگست کو دہلی پہنچ گیا۔ میں سیدھا دفتر گیا اور آفس میں حاضری دی۔ وہاں مجھے ایک رقعہ ملا جس میں یہ حکم تھا کہ میرا تبادلہ مشرقی پاکستان ہوگیا ہے، میں فوراً راجشاہی جانے کی تیاری کروں۔

یہ میرے لیے ایسا حکم نامہ تھا جیسے آسمان سے میرے سر پر بجلی گر پڑی ہے۔ میرے لاہور جانے سے پہلے یہی تصور کیا جاتا تھا کہ دہلی سے ہم سب کراچی جائیں گے۔ اس دوران یہ کیا تبدیلی ہوگئی۔ پاکستان میں ہونے والے آثاریات کے نامزد ڈائریکٹر مسٹر کیو ایم منیر ہمارے ساتھ ہی نقوی صاحب کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے بڑے بھائی صاحب سے ملاقات بھی کی تھی۔ ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ ہم دونوں امرتسر جا رہے ہیں۔ وہاں سے میرے بڑے بھائی کراچی جائیں گے اور وہاں میرا انتظار کرتے ہوئے کسی قسم کی تجارت کا بندوبست کریں گے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے میرا تبادلہ مشرقی پاکستان کر دیا گیا اور یہ توقع ظاہر کی کہ اگر جوان آثارشناس وہاں نہ جائیں تو پاکستان کا مقصد کیسے حل ہوگا۔ شاید میرے وہاں جانے سے ہی پاکستان کا وجود محفوظ ہوسکتا تھا۔ میرے خاندان کی بربادی اور قربانی سے ہی پاکستان بچ سکتا تھا۔ ایسی حرکت منیر صاحب نے کیوں کی۔ میں نہیں سمجھ سکا۔ اگر بعد میں جو واقعات کراچی میں میرے ساتھ ہوئے اس کے پس منظر میں اس کو دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ میں کوئی سازش کا شکار بن گیا اور ہمیشہ یہی کوشش رہی کے مجھے ایسا نقصان پہنچایا جائے اور دور مشرقی پاکستان میں رکھا جائے کہ میری کوئی شنوائی نہ ہو سکے۔ اس محکماتی سازش کا پورا بیان اگلے باب میں آئے گا۔ اس سازش میں اصل کردار کون ادا کر رہا تھا یہ تو شاید میں کبھی نہ بتا سکوں لیکن اس سے میرا اور محکمے کو جو نقصان ہوا اس کا ذکر ضرور وقتاً فوقتاً کرتا چلوں گا۔

15 اگست کو دہلی میں آزادی کا دن منانے کے بعد منیر صاحب اور نقوی صاحب دونوں مجھے سٹیشن پر الوداع کہنے آئے۔ شاید انہیں یہ خطرہ تھا کہ میں مشرقی پاکستان نہ جاؤں اور دوسری طرف بھاگ جاؤں۔ وہ دونوں یقین دہانی کرنا چاہتے تھے کہ میں ریل میں سوار ہو کر کلکتہ کی طرف روانہ ہوگیا ہوں۔ میں کلکتہ جانے والی ریل میں بیٹھ ضرور گیا تھا لیکن اپنے خاندان کی گاڑی کو آگ لگا کر، ریل سے جو دھواں نکل رہا تھا میں اس میں گم تھا اور خاندان والوں کا خیال

بہت پریشان کررہا تھا۔ منیر صاحب اور نقوی صاحب بھی اپنے گھر واپس نہ جاسکے۔ دہلی میں فساد شروع ہوگیا اور وہ سیدھے پناہ گزیوں کے کیمپ پرانے قلعہ میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد وہ خیریت سے کراچی چلے گئے اور میں دہلی کے فساد سے بچ کر پہلے کلکتہ آیا۔ دو دن وہاں قیام کرنے کے بعد جیسے ہی راجشاہی کے لیے ریل میں سوار ہوا معلوم ہوا کہ کلکتہ میں بھی زوردار فساد شروع ہوگیا ہے۔ ان سے میں بچ نکلا اور راجشاہی بخیریت پہنچ گیا لیکن اپنے خاندان کا بیڑا عالمی سمندر کی ظالم موجوں کے حوالہ کردیا تھا جس کی نہ منزل کا علم تھا اور نہ ہی بظاہر کوئی سہارا۔

میرے خاندان والوں کو معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں کیونکہ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا تھا کہ میں خط لکھ سکوں۔ بسنہ میں یہی امید تھی کہ میں کراچی چلا گیا ہوں گا اور ادھر اپنے بڑے بھائی سے مل کر وہاں کوئی نہ کوئی میں انتظام کروں گا تاکہ وہ سب کراچی آسکیں۔ ادھر بڑے بھائی انتظار کرتے رہے اور یونہی دن گنتے رہے کہ شاید میں اب آجاؤں، جب کئی دن اسی طرح گزر گئے اور میں کراچی نہیں پہنچا تو انہوں نے یقین کرلیا کہ میں یا تو دہلی میں یا راستہ میں کہیں مارا گیا اور میرے کراچی پہنچنے کی امید سے وہ ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب اکیلے وہ بہت پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا انتظام ہوسکتا ہے۔ اس وقت کراچی میں بھی بہت افراتفری تھی، انہیں صحیح صلاح مشورہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلے تنگ آگئے اور انہیں اپنے بیوی بچوں کی یاد بھی ستانے لگی جنہیں وہ بسنہ چھوڑ گئے تھے۔ دوسرے کام کی کوئی سمجھ نہ آئی۔ ادھر نہ جانے کیا کیا باتیں ان کے دماغ میں آئی ہوں گی۔ ان سب پریشانیوں کے سبب اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکے اور آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو فوراً واپس بسنہ جانا چاہیے اور کوئی دوسرا انتظام کرنا چاہیے۔ اس بوکھلاہٹ اور افراتفری میں اپنی ساری رقم اس گجراتی میمن کے حوالے کردی جو ان کا تجارت میں شریک کار تھا۔ واپس جانے کے لیے پوچھ گچھ کی اور کھوکھراپار کے راستے راجستھان کے ریگستان سے گزرتے ہوئے کافی دنوں کی مسافت کے بعد بسنہ پہنچے۔ والد صاحب کو انہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن ان کا پاکستان جانے کا خواب ختم ہوگیا۔ رقم بھی جاتی رہی اور اس وقت تک میرا بھی اتہ پتہ نہ چل سکا تھا۔

اب ادھر چھوٹے سے گاؤں بسنہ میں بھی تنازع بڑھنے لگا، مدتوں سے اکٹھے رہنے

والے لوگوں میں فتنہ شروع ہو گیا۔ وہ سکھ جو پنجاب سے اپنے روپیہ پیسے کے لین دین کے سلسلے میں آتے جاتے رہے ہیں اور جن کا تعلق میرے خاندان والوں کے ساتھ اتنا پرانا تھا اور اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ جاتے وقت سونے اور روپوں سے بھرے ہوئے صندوق میرے چچا محمد سکندر کے گھر جلد بازی میں بغیر کسی تصدیق کے رکھ کر چلے جاتے لیکن اب وہ بھی تیز ہو گئے۔ پنجاب سے بھاگ کر ان کے اور بھی رشتہ دار بسنہ آ گئے۔ سندھ سے بھی کئی ہندو وہاں پہنچ گئے اور مارواڑی تاجر بھی اس گاؤں کی بڑھتی ہوئی تجارت میں حصہ لینے آ پہنچے اور ان نو وارد لوگوں نے فتنہ کو بڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دانی خاندان کے لوگ بسنہ سے نکل جائیں تو ان کی زمینیں اور تجارت ان کے اپنے ہاتھ لگ جائے اور اگر وہ اپنی مرضی سے نہ جائیں تو مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور لڑکیوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ بات یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ہمارے گھر کی لڑکیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر سکھوں نے حملہ کیا تو وہ سب خودکشی کر لیں گی اور میں ان سب باتوں سے بے خبر الگ تنہا پریشان ہو رہا تھا۔

اس فتنہ فساد کی فکر میں میرے والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں سے دور رائے پور شہر میں ایک نیا مکان بنالیں تاکہ وہاں محفوظ رہ سکیں۔ اب انہوں نے بھارت میں ہی رہنے کا پکا ارادہ کر لیا اور اس ارادے کو ظاہر کرنے کے لیے اور ہندوؤں کو یقین دلانے کے لیے کہ اب وہ پاکستان نہیں جا رہے ہیں ایک بہت بڑی زمین رائے پور شہر میں کمشنر صاحب کے گھر کے قریب ہی خریدی اور مکان بنوانا شروع کر دیا۔ مکان بننے کے بعد میرے بڑے بھائی صاحب کے سب گھر والے شہر منتقل ہو گئے۔ میرے والد صاحب کبھی گاؤں اور کبھی شہر میں آتے جاتے رہے۔ انہیں اور بڑی فکر تھی میری دوسری بڑی بہن تاج بیگم اپنے دو چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کر آزادی سے پہلے بسنہ آئی تھی اور اس وقت تک وہ وہیں تھیں لیکن ان کا خاوند اور تین بچے جو امرتسر میں تھے ان کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اسی طرح میرے پھوپھا کی لڑکی ذاکرہ بیگم جن کی شادی امرتسر میں ہوئی تھی وہ بھی بسنہ میں تھیں اور ان کے خاوند امرتسر میں تھے۔ کچھ مہینوں کے بعد میری دو چاچیاں جو امرتسر میں تھیں اور کسی طرح لاہور بھاگ کر چلی گئی تھیں بسنہ واپس پہنچیں اور ان سے معلوم ہوا کہ امرتسر کے رشتہ دار کیسے بچ بچا کر لاہور کے والٹن کیمپ میں اترے۔ اس کے بعد کچھ نسبت

روڈ، کچھ گوالمنڈی میں اور کچھ راولپنڈی اور ہزارہ کی طرف بھاگے اور کوئی ملتان کی طرف۔ یہ مسلمانوں کی مشرقی پنجاب سے ہجرت نہیں بلکہ وہاں سے جان بچا کر پناہ لینے کا سوال تھا۔ دونوں پنجاب میں آبادی کے تبادلہ کا سوال ہی نہیں تھا۔ بلکہ مشرقی پنجاب میں مسلم کشی سے اپنے آپ کو بچانے کا مسئلہ تھا۔ امرتسر سے بچ کر جانا آسان تھا پھر بھی اس سے زیادہ مشکل دوسرے شہروں سے نکل بھاگنے کا تھا۔ یہاں کچھ ایسے سکھوں کی ریاستیں تھیں جہاں مقامی حکمرانوں کی مدد سے جو مسلمانوں کی قتل وغارت گری ہوئی اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ یہاں سے بچ کر نکل جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ نہتے لوگ مسلح سپاہیوں کے سامنے کیا کر سکتے تھے۔ مردوں اور بچوں کو قتل کرنا بڑا آسان تھا اور ان کی عورتوں اور لڑکیوں کا جو حشر کریں سب ان پر منحصر تھا۔ یہ انسان اور انسانیت کی بڑی دردناک کہانی ہے کیونکہ یہ خانہ جنگی کسی اخلاقی قانون کے اندر نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بربریت اور وحشی حرکتوں کا بدترین نمونہ پیش کر رہی تھی۔ یہ تاریخ کے صفحات پر بدنما داغ ثبت کر رہی تھی۔ اس میں انسان اور انسانیت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ درندہ صفت انسان کے نام کو بدنام کر رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کا شکار ہو رہا تھا۔ لوٹ کھسوٹ تو کسی حد تک جائز ہے لیکن بے گناہ اور بے سہارا لوگوں کو قتل کرنا زندہ انسان کو آگ میں پھینکنا کس کتاب میں کس اصول میں اور کس مذہب میں جائز ہے۔ کیا یہ انسانی حقوق کو پاش پاش کرنے کے مترادف نہیں۔ کیا اس قسم کی وحشت ناک خانہ جنگی کو بھی انسان ہنس کر ٹال سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس بربریت کو کیوں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں عالم انسان کی آواز اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ کیوں ساری دنیا اس وقت خاموش تماشائی بنی آگ اور خون کا کھیل دیکھتی رہی۔ اس قسم کی بربریت دنیا کے کسی خطہ میں ہو، حقوق انسانی اور اخلاق و آداب کی خلاف ورزی ہے۔ اس کو تسلیم کرنا انسانیت کی عظمت کی توہین ہے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس میں بھی ہم کوئی طریقہ کار اختیار کریں تاکہ انسانی اخلاق اپنے پروقار معیار پر قائم رہے۔ اسے فرقہ وارانہ فساد کہہ کر ٹال دینا کافی نہیں۔ یہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ اس وقت جو مسلمان بھارت میں رہ گئے ہیں انہیں وہاں کے آزاد شہری کے حقوق حاصل نہیں۔ وہ اقلیت میں ہیں لیکن ان کا بھی حق ہے کہ وہ آزاد زندگی بسر کریں۔ فساد کے نام پر انہیں قتل کرنا انسانیت کے دائرے سے باہر ہے۔

میں پہلی دفعہ بنگال گیا تھا۔ راجشاہی پہنچ کر میں نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔ میرے بڑے افسر مولوی شمس الدین احمد تھے۔ جن کا تعلق مرشد آباد سے تھا۔ شاید اسی لیے آثاریات کا دفتر انہوں نے راجشاہی میں کھولنے کا ارادہ کیا۔ سٹیشن سے اتر کر میں سیدھا ریندر ریسرچ میوزیم گیا۔ رات وہیں گزاری اور پہلی مرتبہ بنگال کے بڑے بڑے مچھروں کا تجربہ ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک رہائشی مکان کرائے پر مل گیا۔ مولوی صاحب اور میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ مولوی صاحب اوپر کی منزل میں اور میں نیچے کی منزل میں۔ جب تین ماہ گزر گئے تو بسنہ جانے کے ارادے سے چھٹی لی۔ راجشاہی سے میں نے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں بنگال میں ہوں۔ جب میں بسنہ پہنچا تو مجھے دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی قیمتی گم شدہ چیز مل گئی ہو سب سے زیادہ خوشی میری والدہ کو ہوئی ان کے نزدیک تو میں گم یا ختم ہو گیا تھا۔ وہ رو رو کر مجھے ایک نظر دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ایک طرف تو بڑی خوشیاں منائی گئیں اور دوسری طرف اس گاؤں کی بدلتی ہوئی فضا نے سب کو فکر مند کر دیا تھا۔ مجھے بھی اس تبدیلی پر بھی حیرانگی ہوئی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں بھی اس قسم کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ دانی خاندان کو اس گاؤں میں آباد ہوئے ستر سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ پرانے گاؤں کے رہنے والے خاص کر گونڈ اور اڑیا لوگ ان کے بہت ممنون تھے اور ہمیشہ کی طرح عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن نوارد لوگوں کو پرانے رشتوں اور پرانی تاریخ کا کیا علم۔ یہاں جو کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، وہ سب ان کی وجہ سے تھیں۔ بڑے بھائی صاحب بھی مجھے ملے دونوں کو حیرانی ہوئی میں یہ سن کر اداس ہو گیا کہ وہ کراچی سے بھاگ کر واپس آئے ہیں۔ آنے کے بعد جو کچھ یہاں فیصلہ کیا گیا اس سے میں بالکل متفق نہیں تھا۔ سب نے شکایت کا بوجھ میرے کاندھے پر ڈال دیا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی ارادوں کے بدلنے کے قابل۔ کوئی بھی مشرقی پاکستان جانے کو تیار نہیں تھا۔ جب میری چاچیوں نے پنجاب کا حال سنایا تو وہ بہت ڈر گئے۔ انہیں یہ خیال آیا کہ وہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ ایسی غیر یقینی کی صورت میں میرے والد صاحب نے جو قدم اٹھایا تھا وہ شاید اس وقت کے تقاضوں کے مطابق بہتر تھا۔ میں نے یہ سب کچھ قبول کیا اور والد صاحب سے کہا کہ اب یہ ضروری ہے کہ میں اپنے حصہ کی ساری جائیداد

بڑے بھائی کے نام کردوں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ اس کا بھی بندوبست ہو گیا اور اب کوشش یہ ہوئی کہ جس کسی کو پاکستان جانے کا موقع ملے وہ ضرور چلا جائے۔

اسی تجویز کو مانتے ہوئے میرے سب سے چھوٹے چچا غلام محی الدین دانی نے فیصلہ کیا کہ وہ بسنہ ترک کر کے کراچی منتقل ہو جائیں گے۔ اس میں دوسرا ہاتھ ان کے سسر مرزا صالح محمد کا بھی تھا جو بسنہ میں نوارد تھے اور اس گاؤں سے ان کا لگاؤ بھی اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ایک قافلہ بسنہ سے ممبئی کے لیے روانہ ہوا۔ اس میں چچا صاحب کے سارے خاندان والے، مرزا صاحب اور ان کے دوسرے داماد اور بچے۔ میری بڑی ہمشیرہ اور ان کے بچے، پھوپھا عبدالحمید کی لڑکی ذاکرہ بیگم، سب کے سب رات کی تاریکی میں ایک ٹرک کے ذریعہ روانہ ہوئے اور پانی کے جہاز کے راستہ کراچی پہنچے۔ چچا صاحب سے کچھ دن اور قیام کیا کہ زمین کے کاغذات کے متعلق کچھ باتیں طے کر لیں۔ یہ سب کچھ میرے بسنہ جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چچا صاحب نے کاغذات میرے والد صاحب کے حوالے کیے تھے اور پھر کراچی چلے گئے اور پھر کبھی بسنہ کا نام نہیں لیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس ردوبدل میں بھائیوں میں آپس کے اندر کیا بات چیت ہوئی۔

میری چھٹی اب ختم ہونے کو آئی۔ اس دوران میں اپنے چچیرے بھائی محمد حسن دانی سے ملا اور اپنی شادی کا ذکر کیا۔ انہیں پرانی باتیں یاد آ گئیں اور فوراً سمجھ گئے کہ میری اب بھی خواہش صفیہ سلطانہ سے شادی کرنے کی ہے۔ چونکہ وہ اپنے سسر اور ہمارے چچا محمد سکندر دانی کے گھر ہی رہتے تھے امید تھی کہ یہ شادی کا پیغام وہ خسر تک پہنچا دیں گے اور آخر یہی ہوا۔ اس سے ان کی بیٹی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور دانی خاندان کی ایک اور لڑکی پاکستان چلی جائے گی لیکن اس کم وقت میں شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف چچا کی رضامندی ہی معلوم کی جاسکتی تھی۔ میں نے اپنے والدین سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ جب جانے کا وقت آیا والدہ صاحبہ مجھ سے لپٹ گئیں اور ان کے ساتھ میری سب سے چھوٹی بہن عابدہ بیگم بھی آنسو بہانے لگیں۔ میں نے والد صاحب سے ذکر کیا اور یہ طے پایا کہ میرے ساتھ والدہ اور چھوٹی بہن اور بڑے بھائی کی لڑکی الماس بیگم راجشاہی جائیں گی۔ ان سب کو اپنے ساتھ میں راجشاہی لے آیا اور اسی کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ مولوی صاحب کو بڑا تعجب ہوا کہ میں واپس راجشاہی کیسے آ گیا اور کس طرح دیگر لوگوں

کو ہمراہ لے آیا۔ ان کا تو خیال تھا کہ شاید میں مغربی پاکستان جاؤں گا۔ کیونکہ ان کے ساتھ وہاں کی باتیں اکثر ہوتی تھیں اور ان سے ذکر کرتا تھا کہ کس طرح ہمارا خاندان وہاں جانے کا خواہشمند ہے۔

بہرحال میں راجشاہی میں کام کرتا رہا اور وہاں کے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا۔ جیسے میں نے دوسرے باب میں ذکر کیا ہے۔ چند ماہ کے بعد کراچی سے ایک راز دار خط خواجہ ظہیرالدین صاحب کا ملا جس میں انہوں نے غیرملکی وظیفہ کا ذکر کیا تھا۔ اپنے خط میں مجھے یہ یقین دہانی کرائی کہ میں کسی وقت بھی لندن جانے کے لیے تیار رہوں۔ ایسی حالت میں میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنی والدہ، بہن اور بھتیجی کو واپس بسنہ بھیج دوں اور لندن جانے کے لیے تیار رہوں۔ مجبور ہو کر میں نے انہیں بسنہ بھیج دیا اور ساتھ ہی ایک خط محمد حسن دانی کو لکھ دیا کہ اب میری شادی بسنہ میں ہونا ممکن نہیں کیونکہ میں لندن کئی سال کے لیے جانے والا ہوں اور اس دوران پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ صفیہ سلطانہ کی شادی اب میرے ساتھ ہونا بہت مشکل ہے۔ راجشاہی میں کراچی سے خط آنے کا میں انتظار کرتا رہا۔ کئی مہینے گزر گئے لیکن کوئی حکم نامہ نہیں ملا۔ بڑی پریشانی ہوئی لیکن میں وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سال 1948ء کے کئی ماہ گزر گئے۔ سر مارٹیمر وہیلر پاکستان میں آثاریات کے آفیسر بن کر آئے۔ یہ وہی وہیلر ہیں جو پہلے ہندوستان میں آثاریات کے ڈائریکٹر جنرل رہ چکے تھے اور میرے استاد بھی تھے۔ کراچی پہنچتے ہی انہوں نے سارے آثاریات کے آفیسروں کی ایک میٹنگ منعقد کی۔ مجھے بھی پہلی دفعہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے میں نقوی صاحب کے گھر اترا اور بعد میں چچا محی الدین دانی کا گھر ڈھونڈ کر ان کے پاس آ گیا۔ سر مارٹیمر نے ایک کتاب لکھنے کی تجویز پیش کی جس کا نام Five Thousand years of Pakistan (پاکستان کے پانچ ہزار سال) تھا۔ ہم افسروں کو ایک ایک باب لکھنے کے لیے دیا گیا۔ مجھے حکم ہوا کہ میں اپنا حصہ کراچی میں بیٹھ کر لکھوں۔ اس کام کے لیے ایک ماہ کے قریب مجھے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس دوران میں نے اپنے والد صاحب کو خط بھی لکھا اور اس کا جواب بھی مجھے ملا۔ والد صاحب کو بہت خوشی ہوئی کہ میں کراچی میں اپنے چچا کے گھر قیام کر رہا ہوں۔ انہوں نے ایک ایک خط ہم دونوں کو لکھا

اور واضح کر دیا کہ اب میری شادی کراچی میں ہو جائے، میں بھی وہاں ہوں اور چچا کی لڑکی بھی وہاں ہے۔ مجھے خط پڑھ کر بڑی حیرانگی ہوئی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ مجھے کیوں کراچی میں شادی کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ خط ملتے ہی میں گھر سے باہر نکل گیا۔ کبھی کلفٹن اور کبھی کسی اور باغ میں پھرتا رہا۔ رات کو دیر سے واپس آیا۔ چچا نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو کام کا بہانہ کر دیا لیکن وہ میری پریشانی کو سمجھ گئے۔ شاید ان کو بھی یہ محسوس ہو گیا کہ میں اس شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں یہ بھی سن چکا تھا کہ ان کی بڑی بیٹی کی شادی ان کی بیوی کے رشتہ داروں میں ہونے والی ہے۔ شاید میرے والد صاحب کو اس کا علم نہیں تھا۔ میں سارا چکر سمجھ گیا۔ ہو نہ ہو یہ کوئی زمین کا ہی مسئلہ ہے۔ بہر حال اس موضوع پر کراچی میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے واپس راجشاہی جانا پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے ایک خط چچا محی الدین دانی کو لکھا اور صاف لکھ دیا کہ اس شادی کے لیے میں اس لیے تیار نہیں ہوں کہ پاکستان میں انہیں بہت سے رشتے مل سکتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کوئی اور چچیری بہن بھارت سے پاکستان آ جائے۔ میں نے اپنے خط میں کسی کا نام نہیں لکھا لیکن وہ سمجھ گئے۔ میں نے ان سے عرض کی تھی کہ وہ میرے والد صاحب کو اس کے متعلق لکھیں اور انہیں راضی بھی کریں۔ انہوں نے خط لکھا لیکن شاید میرے والد صاحب خوش نہیں ہوئے۔ بہر حال کراچی والا معاملہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا اور بسنہ میں میری شادی کی راہ ہموار ہو گئی۔

راجشاہی میں مجھے اب دوسرا بڑا مکان محلہ یتیم خاں میں مل گیا تھا۔ دوستوں کا دائرہ بھی اب بڑھ چکا تھا۔ بہت سے لوگوں کے گھر بھی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ایک میرے بڑے اچھے دوست تھے جن کا نام محسن صاحب تھا وہ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے اور کچے مکان میں رہتے تھے۔ جب مجھے بڑا مکان ملا تو وہ بھی میرے مکان کے پیچھے والے حصہ میں رہنے لگ گئے۔ ان کی بیوی مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ میں ان کے ساتھ ہی کھانا کھاتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے شادی کرنے کے لیے کہا کرتی تھیں۔ 1949ء شروع ہو گیا تھا۔ ماہ رمضان المبارک ختم ہونے والا تھا اور عید کی آمد کی تیاریاں شروع تھیں۔ میں نے چھٹی کی درخواست دی اور پھر بسنہ چلا گیا۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب شادی کر ہی لینی چاہیے۔ محمد حسن دانی سے ذکر کیا اور وہ فوراً تیار

ہو گئے۔ میں نے اپنے بڑے بھائی غلام مرتضٰی دانی اور ان کی بیوی جمیلہ سے بات کی وہ حیران رہ گئے۔ والدہ صاحبہ سے خواہش ظاہر کی اور نام بھی صفیہ سلطانہ کا لیا۔ انہوں نے والد صاحب سے بات چھیڑی۔ والد صاحب بہت ناراض ہوئے کیونکہ میں نے ان کی تجویز رد کر دی تھی۔ میں اپنی بات پر اڑا رہا اور یہی رٹ لگائے رکھی کہ شادی عید کے فوراً بعد ہوگی کیونکہ میری چھٹی بہت کم ہے۔ کسی طرح فیصلہ ہوا اور یکم اگست 1949ء کو میری شادی بسنہ میں میری خواہش کے مطابق چچا محمد سکندر کی لڑکی صفیہ سلطانہ کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔

شادی کے تیسرے دن ہی ہم بسنہ سے روانہ ہوئے۔ میری بیوی ابھی تک برقعہ پہنتی تھیں۔ رائے پور کے سٹیشن پر میں نے ان سے کہا کہ یہ برقعہ اب یہیں سے بسنہ واپس کر دو۔ اب ہمیں اپنی زندگی اور طرح سے گزارنی ہوگی۔ اب بسنہ کا گھٹا ہوا ماحول نہیں رہا۔ دنیا والوں کے ساتھ ہمیں ملنا جلنا ہے۔ انسان سب برابر ہیں۔ انہی کے ساتھ ہمیں جینا ہے، مرنا ہے، کھانا ہے، کھیلنا ہے اور کودنا ہے اس لیے برقعہ میں بند زندگی کو ختم کرو۔ شرم و حیا اور اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بات کو سمجھو کہ تمہیں اپنی طاقت پر بھروسہ کر کے دوسرے انسانوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت کسی سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں، خود اعتمادی پیدا کرو۔ وہ چپکے سے مان تو گئیں لیکن اس تبدیلی کو عملی جامہ پہنانے میں کافی وقت لگا۔ راجشاہی پہنچتے ہی میں نے ایک ماہ کا دورہ کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ اس میں ہم دونوں نے ڈھاکہ، سلہٹ، چٹاگام، دبارسال اور کھلنا وغیرہ کی خوب سیر کی۔ میری بیوی دھیرے دھیرے میرے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل شروع کر چکی تھیں۔ گھر میں اور دیگر جگہ عورتوں کے ساتھ چائے نوشی پھر اکٹھے مرد اور عورتوں کے ساتھ بیٹھنا اور تھوڑی تھوڑی باتیں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اتنا ہو گیا کہ ہمارے دفتر کے کارکنوں کے ساتھ بیٹھ کر گروپ فوٹو بھی بنوایا۔ لیکن راجشاہی کا ماحول ایسا تھا کہ نہ تو انہیں میرا گھر پسند آیا کیونکہ سانپ بہت تھے اور نہ ہی شہر کیونکہ بارش بہت زیادہ ہوتی تھی۔ سڑکیں کچی جس کی وجہ سے گندگی بہت ہوتی تھی۔ دوسرے نہ تو بنگالی سمجھ سکتی تھیں اور نہ بول سکتی تھیں۔ انہیں اپنا آبائی گاؤں بسنہ بہت یاد آتا اور والدین کو بہت یاد کرتیں اور بضد تھیں کہ بنگال میں نہیں رہ سکتیں۔ وہ مغربی پاکستان ہی جانا چاہتی ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ان کے والد صاحب تشریف

لائے اور وہ مجھے تنہا چھوڑ کر بسنہ چلی گئیں۔

میں سوچتا رہا کہ اب کیا ہوگا۔ میں اپنی ملازمت چھوڑ کر مغربی پاکستان کیسے جا سکتا ہوں۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میری شادی کے وقت میرے والدین کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی عابدہ بیگم کی شادی کی فکر تھی۔ میں نے اس کی ذمہ داری قبول کی تھی اور کہا تھا اس کی شادی مغربی پاکستان میں کسی کشمیری خاندان میں کرانے کی کوشش کروں گا۔ یہ سب سوچ کر میں نے ایک ماہ کی رخصت کی درخواست دی اور بسنہ آ گیا۔ وہاں سے اپنی بیوی' والدہ صاحبہ اور چھوٹی ہمشیرہ کو ساتھ لے کر بمبئی سے ہوتے ہوئے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی آ گئے۔ وہاں چچا محی الدین دانی کے گھر قیام کیا اور سوچا ایک اور کوشش مغربی پاکستان میں تبادلہ کی کر لی جائے۔ یہ بھی ناکام رہا۔ میں نے آخر استعفیٰ کی درخواست دے دی اور کراچی سے ملتان چلا گیا جہاں ہماری پھوپھی شاہ زمانی بیگم اپنے خاوند حکیم محمد جان کے ساتھ امرتسر سے آ کر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ ایک ماہ کے بعد میں لاہور چلا گیا جہاں میری سب سے بڑی ہمشیرہ تاج بیگم اپنے خاوند خواجہ عبداللطیف کے ساتھ نسبت روڈ میں رہتی تھیں۔ میرا مقصد صرف سیر و تفریح کرنا نہیں تھا لیکن تقسیم برصغیر کے بعد رشتہ داروں سے ملنا ضرور چاہتا تھا۔ ساتھ ہی ذریعہ معاش کی بھی تلاش تھی۔ استعفیٰ تو میں دے چکا تھا اور اب کوئی نہ کوئی کام تو کرنا تھا۔ میرے پاس نہ مکان تھا' نہ ملازمت آخر کیسے اور کہاں گزارا ہوگا۔ اسی کوشش میں روز و شب گزار رہا تھا۔ کبھی رشتہ داروں سے تجارت کے متعلق بات کرتا لیکن اس کا مجھے تجربہ نہیں تھا۔ کبھی کسی رسالہ یا اخبار میں کام کرنے کا خیال' تو کبھی پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت کا سوچتا لیکن یہ کیسے ممکن تھا' میں کسی کو نہیں جانتا تھا اور نہ کسی کو میرے کام سے واقفیت تھی۔ اسی کشمکش میں بیٹھا رہتا اور اپنے بزرگ خواجہ غلام محمد سے صلاح مشورہ کرتا۔

ایک دن میں خواجہ عبداللطیف کے گھر نسبت روڈ میں بیٹھا تھا کہ ایک تار موصول ہوا اور یہ تار سر مارٹیمر وہیلر نے کراچی سے بھیجا تھا۔ مجھے فوراً کراچی پہنچنے کو کہا تھا اور استعفیٰ کی واپسی اور آثار یاتی کھدائی سمجھانے کا حکم تھا اور ساتھ موہنجوداڑو جانے کی تیاری کروں تھوڑی سی امید ہوئی کہ شاید مغربی پاکستان میں رہنے کا موقع مل جائے گا۔ والدہ' بیوی اور بہن کو لاہور میں چھوڑا اور اپنے بھائی جان سے درخواست کی کہ کوئی مکان کرائے کا ان کے لیے لے دیں اور خود کراچی چلا گیا۔

میرے استاد سر مارٹیمر کا حکم تھا اس کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ جب میں موہنجوداڑو میں کھدائی کر رہا تھا اس وقت لاہور میں اچھرہ کے علاقہ میں ایک مکان کا اوپری حصہ میری بیوی نے کرائے پر لے لیا تھا۔ اسی دوران جب وقت آیا میری بیوی نسبت روڈ آ گئی اور میری بڑی بچی فوزیہ سلطانہ میرے بھائی کے گھر کے تبی لے میں 25 اپریل 1950ء میں پیدا ہوئی۔ یہ تبیلا اصل پرانا موٹر گیراج تھا۔ جب کھدائی ختم ہوگئی تو مئی کے شروع میں موہنجوداڑو سے میں لاہور آیا اور اپنی لڑکی کو پہلی مرتبہ دیکھا۔

مجھے ہدایت دی گئی کہ لاہور میں ہی بیٹھ کر کھدائی کے متعلق لکھوں۔ میں بہت خوش ہوا۔ مجھے اب کچھ کچھ یقین ہوگیا تھا کہ میری ملازمت مغربی پاکستان میں پکی ہوگئی ہے لیکن یہ صرف خیال ہی ثابت ہوا کیونکہ ابھی ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے واپس راجشاہی جانے کا حکم نامہ مل گیا۔ مجبوراً میں اپنی بیوی، والدہ اور چھوٹی ہمشیرہ کو لاہور میں ہی چھوڑ کر راجشاہی چلا گیا۔ وہاں یہی سوچتا رہا کہ اس ملازمت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اسی دوران میری بیوی سخت بیمار ہوئی۔ اسے ٹائیفائیڈ ہوگیا۔ خواجہ غلام محمد صاحب نے مجھے تار بھیجا کہ میں جلد لاہور پہنچوں، چھٹی کی درخواست دی لیکن منظور نہیں ہوئی۔ میں نے پھر استعفیٰ دے دیا اور راجشاہی کو خیر باد کہہ کر ڈھاکہ سے لاہور جانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اچانک مجھے ڈھاکہ یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی جس کی اطلاع میں کسی کو نہ کر سکا۔ جب میں لاہور ہوائی اڈے پر پہنچا تو خواجہ غلام محمد صاحب خوش آمدید کرنے کے لیے وہاں موجود تھے۔ میری بیوی غصہ کی وجہ سے نہیں آئی۔ وہ سوچتی تھی کہ اب ہم کہاں جائیں گے۔ رہی سہی ملازمت بھی گئی۔ گھر کا بوجھ اتنا زیادہ ہے۔ میری چھوٹی بہن کی شادی بھی ہونی ہے۔ اب ہم گھر کا کرایہ کہاں سے دیں گے، کھائیں گے کہاں سے۔ میں نے اترتے ساتھ ہی خواجہ صاحب کو اپنی نئی ملازمت کا رقعہ تھما دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ میرے سر پر ہاتھ رکھا، مبارکباد دی اور کہنے لگے کہ ان کو پورا یقین تھا کہ میں خالی ہاتھ لاہور نہیں آؤں گا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ سب ان کی دین ہے وہ خوشی خوشی ٹانگے میں اچھرہ لے گئے اور نیچے ہی سے میری بیوی کو آواز دی کہ دیکھو میرا بیٹا کیا لایا ہے۔ میری نئی ملازمت کی خوشخبری سب کو دی۔ پھر بیوی نے کہا کہ آخر پھر وہیں بنگال جانا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اب راجشاہی نہیں بلکہ ڈھاکہ جانا ہے۔

اسی دوران میرے بڑے بھائی غلام مرتضیٰ دانی بھارت سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اب میری چھوٹی بہن عابدہ بیگم کی شادی کے لیے رشتے آنے لگے۔ ہم دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ سید احمد وائیں کا رشتہ منظور کیا جائے۔ بات پکی ہوئی اور نکاح بھی ہوگیا۔ صرف رخصتی باقی رہی۔ اب میں نے سب گھر والوں سے کہا کہ ڈھاکہ جانا ہے۔ اچھرہ کو خیرباد کہنا ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں اپنی والدہ کو ہمشیرہ کے لیے مغربی پاکستان میں رکھ سکوں گا۔ اس کے لیے میں نے آثاریات کی ملازمت سے استعفیٰ دیا لیکن دوسری نوکری جو ملی وہ بھی مشرقی پاکستان میں تھی۔ چھوٹی بہن کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا لیکن اپنی والدہ صاحبہ کے لیے میں کچھ نہ کرسکا۔ یہ ارمان میرے دل میں ساری عمر کے لیے باقی رہ گیا۔ میری والدہ ہمیشہ کے لیے لاہور چھوڑنے پر مجبور ہوئیں لیکن ڈھاکہ جانے کی بجائے پھر وہ اپنی پرانی جگہ بسنہ چلی گئیں جہاں اپنے خاوند یعنی میرے والد کے ساتھ دن گزارنے لگیں۔ میں ڈھاکہ چلا گیا اور میری بیوی بھی وہاں آ گئی اور اب ڈھاکہ میرے خاندان والوں کے لیے ذریعہ راہ بن گیا۔ ان دنوں بھارت سے مغربی پاکستان جانے کے لیے اجازت نامہ کی ضرورت پڑتی تھی لیکن مشرقی پاکستان کا راستہ کھلا تھا۔ میرے رشتہ دار اکثر بسنہ سے ڈھاکہ آتے اور وہاں سے کراچی یا لاہور جاتے۔ قریب ایک سال کے بعد میرے والد غلام نبی دانی صاحب نے اسی راستہ سے لاہور جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی آخری بیٹی کی رخصتی کردیں۔ ڈھاکہ آنے کے دو اور فائدے تھے۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے نسبت سونے کی قیمت کہیں زیادہ تھی۔ رخصتی کے خرچ کے لیے وہ بھارت سے سونا لے کر آئے تھے جسے ڈھاکہ میں فروخت کیا اور پیسہ جمع کر کے میری بہن کے ساتھ لاہور تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں اس کی بدائی کی۔ ان کی یہ بڑی ذمہ داری بھی ختم ہوئی۔ اسی دوران میرا پہلا لڑکا انیس احمد 16 دسمبر کو ڈھاکہ میں پیدا ہو چکا تھا۔ دو ماہ کے بعد اس کا عقیقہ ڈھاکہ میں اپنے والد صاحب کی موجودگی میں کیا۔ اس طرح وہ اس رسم میں شریک بھی ہو سکے اور میرے بچے کو دیکھ کر خوش بھی ہوئے۔

میرے والد صاحب جولائی 1955ء میں فوت ہوئے۔ انہیں بسنہ میں ذاتی قبرستان کے اسی احاطہ میں سپرد خاک کیا گیا جہاں دانی خاندان کے بانی احد جو دانی مدفون ہیں اس کی وجہ

یہ تھی کہ محمد جو کے زمانے میں بسنہ کی زمینداری کا آغاز ہوا تھا اور ٹھیکہ لیے (90) سال کے بعد میرے والد صاحب کے زمانہ میں اس کا خاتمہ ہوا۔ بھارت سرکار نے زمینداری کا نظام ختم کر دیا تھا۔

اب میری والدہ صاحبہ اکیلی بسنہ میں رہ گئیں جنہیں ملنے کے لیے میں ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ڈھاکہ سے وہاں جاتا تھا۔ ڈھاکہ سے بسنہ جانا بڑا آسان تھا لیکن 1967ء میں مجھے پشاور یونیورسٹی میں جب ملازمت ملی تو بسنہ جانا بند ہوگیا۔ اس طرح والدہ صاحب سے ملنا بھی تقریباً ختم ہوگیا۔ وہ بوڑھی ہوگئی تھیں۔ 80 سال کے قریب ان کی عمر ہوگئی تھی۔ مجھے ہمیشہ یاد کرتیں۔ ہر وقت انتظار کرتیں اور دروازہ کے باہر جھانک جھانک کر دیکھتیں کہ میرا پیارا بیٹا اب آ رہا ہوگا۔ میرے اس آنے کے انتظار میں وہ بستر مرگ پر پہنچ گئیں۔ 1965ء میں پاکستان اور بھارت کی جنگ شروع ہوگئی اور دونوں ملکوں کے درمیان آنے جانے کا سلسلہ بالکل ہی منقطع ہوگیا لیکن میری ضعیف والدہ کو کیا معلوم کہ جنگ کہاں اور کیسے ہو رہی ہے اس کی بیہوشی میں بھی صرف اور صرف یہی خیال تھا کہ میرا بیٹا احمد حسن آ رہا ہے۔ ان کی آنکھیں میرے انتظار میں پتھرا گئی تھیں۔ وہ مجھے ایک نظر دیکھنے کی خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں دبائے رختِ سفر باندھ رہی تھیں اور آخر وہ لمحہ آ پہنچا ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور آنکھیں پھر ہمیشہ کے لیے بےنور ہوگئیں۔ محبت کی جدوجہد اور کتنی ہے تو شاید میرے انتظار کی اب تاب لاتے ہوئے نکل آئے تھے اور میری بدقسمتی کہ میں آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ وہ بسنہ کی بڑی مسجد کے باہر بھارت کی خاک میں آخری نیند سو گئیں۔ ان کو سکون مل گیا لیکن جب مجھے بہت دنوں کے بعد ان کی وفات کا علم ہوا تو مجھ سے نہ رہا گیا میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ میں اپنی ماں کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ ان کی خواہش کے مطابق انہیں پاکستان کی مٹی میں اپنے ہاتھوں سے دفن نہ کر سکا۔

یہ وہ ماں تھی جو میری خاطر اپنے شوہر سے سر پر ضرب کھا کر ہمیشہ کے لیے اپنے کانوں سے محروم ہوگئی۔ یہ وہ ماں تھی جس سے لپٹ کر میں ایک عرصہ تک سویا اور سکون حاصل کیا۔ بچپن میں کھانے کے بعد جب تک میں ان کے ہاتھ سے دو لقمے نہ کھا لیتا میرا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ جب وہ

کھانا کھاتیں تو میں اکثر ان کے ہاتھ کا لقمہ چھین کر اپنے منہ میں ڈال لیتا اور وہ پیار سے مسکرا کر رہ جاتیں۔ جب میں شہر کے سکول میں گیا تو اپنے ہاتھ سے کھانے کا سامان تیار کرتیں اور میرے ساتھ دے کر ہدایت کرتیں کہ انہیں کھانا اور یاد کرنا۔ جب میں شہر جاتا تو والد صاحب سے چھپا چھپا کر میری جیب میں پیسے ڈالتیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ وہ خود مجھے پڑھائیں گی۔ جب بھی سکول کی چھٹی ہوتی تو وہ میرا انتظار کرتیں۔ میں کبھی بسنہ جاتا اور کبھی سیر کے لیے دوسرے شہر نکل جاتا۔ وہ بہت ناراض ہوئیں کہ میں ان سے ملنے بسنہ کیوں نہیں آیا۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر ایک ایک کر کے سب باتیں پھر میرے دماغ میں تازہ ہوگئیں۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی والدہ کی قبر پر آخری مٹی بھی نہ دے سکا۔ ان کی قبر پر فاتحہ خوانی نہ کر سکا۔ ان کا آخری دیدار بھی نہ کیا اور وہ اس دنیا سے کوچ کر گئیں اور میں پشاور میں روتا رہ گیا۔ شاید دعا بھری ان آنسوؤں کی بارش ان کی روح کو تسکین پہنچا سکے۔

میری بیگم صفیہ دانی اور میرے بچے

آخر اگست 1949ء میں میری شادی صفیہ بیگم سے ہوگئی۔ شادی کے ایک ہفتہ بعد ہم دونوں راجشاہی آئے۔ میری شادی کی ساری تقریب ایک ہفتہ کے اندر اندر مکمل ہوگئی۔ صفیہ بیگم کو یہاں دیکھنے بہت سے لوگ آتے رہے۔ ان کو سب لوگوں کا اس طرح آنا بہت برا لگتا تھا۔ جہاں ہم رہتے وہاں سانپ بہت نکلتے تھے۔ وہ اس ماحول کی عادی نہیں تھیں۔ راجشاہی میں کچھ خاندانوں سے ملنا جلنا تھا۔ میں نے ولیمہ کے طور پر آفس کے لوگوں کو اور دوستوں کو کھانا کھلا دیا۔ بسنہ سے ہم ایک نوکر جس کا نام محبوب تھا، ساتھ لے کر گئے تھے۔ اس دعوت کا کھانا نور محمد اور مخدوم جو آفس کے چپڑاسی تھے اور محبوب نے بیگم صاحبہ کے ساتھ مل کر تیار کیا۔ راجشاہی اس طرح چھوڑا کہ میری بیگم کے والد صاحب نے خواب دیکھا کہ ان کی بیٹی بہت رو رہی ہے۔ انہوں نے ہمارے پاس راجشاہی آنے کا ارادہ کرلیا، اس کی اطلاع ہمیں ملی۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان ملازم ان کے ساتھ تھے۔ پہلے کلکتہ پہنچے پھر راجشاہی۔ عید ہمارے ساتھ منائی۔ عید کے تیسرے دن ہم بسنہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ ایک ہفتہ کی چھٹی لی اور وہیں سے درخواست بھیج دی کہ میں

راجشاہی نہیں آؤں گا۔ اپنی بیگم کی وجہ سے راجشاہی کو چھوڑا۔ ویسے مجھے بھی وہ جگہ پسند نہیں تھی۔ اس کے جواب میں مجھے لکھا کہ موہنجوداڑو میں کام کریں۔ پھر آپ کی ٹرانسفر کر دی جائے گی۔ یہ وعدہ جھوٹا تھا۔ اس دوران بڑی بیٹی فوزیہ 25 اپریل 1950ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ میری امی اور بہن بیگم کے ساتھ تھیں۔ ایک سال لاہور (اچھرہ) میں رہے پھر راجشاہی بھیج دیئے گئے۔ اس دوران بیگم کو ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ اتنی بیمار ہو گئی کہ ڈاکٹر ناامید ہو گئے۔ میں نے چھٹی مانگی نہیں ملی، استعفیٰ دے کر آ گیا۔

میں اپنی بیگم کے متعلق کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں جو قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گی۔ بیگم کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا لیکن ان کو سکول داخل نہیں کرایا گیا۔ ان کے والد صاحب کہتے تھے ہم نے کوئی بیٹی سے نوکری کروانی ہے۔ بیگم کے پھوپھی زاد بھائی عبدالحمید دانی پڑھنے کے لیے سکول جاتے تھے انہوں نے مجید سے کہا کہ سکول میں جو کچھ پڑھتے ہو وہ مجھے گھر پر پڑھا دیا کرو۔ وہ بیگم صاحبہ کو پڑھاتے تھے پھر باقاعدہ ان کا امتحان لیتے تھے۔ انہوں نے مجید سے انگلش پڑھی۔ پھر بسنہ میں ایک پولیس انسپکٹر تھے ان کی بیوی مسز نائیڈو تھیں۔ ان کے ساتھ پریکٹس کے لیے انگلش میں خط و کتابت شروع کی۔ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں۔ جب لندن گئے تو وہاں Z.T.C انگلش لنگویج کی کلاس میں جاتی تھیں۔ دن کو کلاس میں پڑھنے جاتیں اور رات کے وقت دستکاری اور دیگر ہاتھ کے کام سیکھنے جاتیں۔ صبح دس بجے سے پہلے گھر کا سب کام ختم کر لیتیں۔ فوزیہ (بیٹی) اور انیس (بیٹا) کو سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ میرا دوسرا بیٹا نوید 1954ء میں انگلینڈ میں ہی پیدا ہوا۔ 1955ء میں ہم ڈھاکہ واپس گئے اور 1956ء میں میرا تیسرا بیٹا جنید پیدا ہوا۔ چار بچوں کے باوجود بیگم نے پہلے میٹرک اور پھر F.A پاس کیا۔ لندن یونیورسٹی سے مجھے راک فیلر فیلوشپ ملی اور وہاں جا کر بیگم نے Montessori Teaching کی ٹریننگ مکمل کی۔ ڈھاکہ دوبارہ واپس آ کر یونیورسٹی میں بی۔اے آنرز میں داخلہ لیا لیکن امتحان نہ دے سکیں۔

بیگم صاحبہ کو سوشل ورک کا بھی بہت شوق تھا۔ ڈھاکہ کے قیام کے دوران انہوں نے بہت سے دفاعی کام کیے۔ پشاور یونیورسٹی میں انہوں نے Womens Voluntary service (WVS) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کی وہ صدر تھیں۔ یونیورسٹی کی ملازمت

پیشہ اور گھریلو خواتین اس تنظیم کی ممبر تھیں۔ ان سب کی کوششوں سے رقم جمع کرنا، مینا بازار منعقد کرنا اور ورائٹی شو کروانے سے جو رقم ملتی اسے رفاعی کاموں میں لگایا جاتا۔ چودھری محمد علی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی اس طرح کے کاموں کی بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مختصر سی عمارت اس ادارے کے نام کردی تھی جہاں اس تنظیم کی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ بیگم وائس چانسلر ادارے کی سرپرست تھیں۔ کتنے بچوں کی تعلیم کے اخراجات اس ادارے نے برداشت کیے۔ شام کے وقت غریب بچوں کو ادارے کے دفتر میں پڑھایا جاتا۔

ایک اور بات بتا تا چلوں کہ جب میں نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کا فیصلہ کرلیا تو میری تنخواہ 800 روپے تھی۔ بیگم سے کہا 400 روپے میں گھر چلاؤ اور 400 روپے میری پی۔ایچ۔ڈی کے لیے بچاؤ۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ کام کیا اور میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے اپنی بیگم اور دو بچوں کے ساتھ جاسکا۔ میرے کام کی وجہ سے میرا احباب کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ میرے گھر کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رہتے تھے۔ طالب علم اکثر رہنمائی کے لیے آجاتے۔ اس کے علاوہ اساتذہ بھی کچھ سمجھنے کے لیے اکثر آتے رہتے۔ دعوتیں میرے گھر کا معمول تھیں۔ اس سلسلے میں میری بیگم کا کردار بھی قابل ذکر ہے۔ ہمیشہ وہ اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانے کھلاتی تھیں۔ وہ کھانے پکانے میں ماہر تھیں۔ اس کے علاوہ ان میں انتظامی قابلیت بھی بہت تھی۔ گھر کا سارا نظام ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں زیادہ تر باہر کے کاموں میں مصروف رہتا اور بیگم گھر پر اکیلی رہتیں اور گھر چلاتیں لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے گلہ نہیں کیا۔ اس طرح میری زندگی میں جو ایک نظم وضبط ہے اور جتنا میں نے دنیا میں نام پیدا کیا اس کے پس پردہ میری بیگم کارفرما تھیں۔ ان کے بغیر میں ادھورا رہ جاتا اور شاید اتنی شہرت حاصل نہ کرسکتا۔

اولاد

1) فوزیہ اقبال: سب سے بڑی بیٹی فوزیہ اقبال جو ڈاکٹر ہے اور پیتھالوجی کے (Haematology) شعبہ میں سپیشلائز کیا ہے اور وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں پروفیسر رہی ہے۔ ان کی شادی ڈاکٹر محمد اقبال حسین بٹ سے ہوئی جنہوں نے ENT میں

سپیشلائز کیا ہے اور وہ بھی علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں پروفیسر رہے ہیں۔ آج کل لاہور میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج میں پروفیسر ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ایک بیٹی ڈاکٹر ہے۔ ایک ڈینٹسٹ ہے اور بیٹے نے ایم بی اے کیا ہے۔

2) انیس دانی نے دو ماسٹر کیے ہیں۔ ایک Anthropology اور دوسرا فلاسفی میں۔ اس کے بعد Anthropology میں پی۔ایچ۔ڈی بھی کیا ہے۔ آج کل ورلڈ بینک میں بحثیت کنسلٹنٹ کام کررہا ہے۔ ان کی شادی نجمہ صدیقی سے ہوئی ہے۔ انہوں نے بھی Anthropology میں ڈاکٹریٹ کیا ہے اور ورلڈ بینک میں کام کررہی ہیں۔

3) نوید دانی پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔ پاکستان ٹیلیویژن میں کام کرتے تھے۔ ان کی بیگم تنویر ہیں جو گھریلو خاتون ہیں۔

4) جنید دانی نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور آج کل اسلام آباد کے ایک این جی او Action Aid میں کام کررہے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ ایک کا نام تیمور اور دوسرے کا نام نوروز سکندر ہے۔ دونوں بچے زیر تعلیم ہیں۔ ان کی بیوی کا نام منزہ ہے۔ یہ بھی گھریلو خاتون ہیں۔

O------O------O

باب چہارم

پشاور یونیورسٹی سے وابستگی

جولائی 1961ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے تاریخ کے شاگردوں کو لے کر میں مغربی پاکستان کے تاریخی مقامات کے مطالعاتی دورے پر روانہ ہوا۔ کسی جگہ کی تاریخ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان مقامات کا سفر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سے اُس زمانے کی ثقافت، رسم و رواج اور دیگر معلومات کا علم ہوتا ہے۔ طلباء اس سفر کے لیے بہت پر جوش تھے کیونکہ اس سے پہلے انہیں اس قسم کے سفر کا موقع نہیں ملا تھا۔ پاکستان کے مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے میں ان شاگردوں کے ساتھ پشاور آیا۔ میرا بھی پشاور کا یہ پہلا سفر تھا۔ اگرچہ یہاں کی تاریخ سے میں بخوبی واقف تھا۔ درہ خیبر، پاک افغان سرحد، قصہ خوانی اور اندرون شہر کے بازار دکھاتے ہوئے ہم پشاور یونیورسٹی پہنچے۔ پشاور یونیورسٹی اس لحاظ سے ایک منفرد تعلیمی درس گاہ ہے کہ یہاں نرسری کلاس سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی سہولت میسر ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی رہائش کے لیے ان کے گریڈ کے مطابق رہائشی سہولت بھی حاصل ہے۔ ایک طرح سے یہ ایک چھوٹا سا مکمل علاقہ ہے۔ اس یونیورسٹی میں میری ملاقات اُس وقت کے وائس چانسلر جناب چوہدری محمد علی صاحب سے ہوئی۔ دورانِ گفتگو انہیں معلوم ہوا کہ میں آثارِ قدیمہ کا ماہر ہوں۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ وہ یونیورسٹی میں آثارِ قدیمہ کا شعبہ کھولنا چاہتے ہیں مگر اس مضمون کا پڑھانے والا کوئی نہیں ملتا اور کہا کہ میں پشاور یونیورسٹی میں آ جاؤں۔ یہاں میں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چودھری محمد علی صاحب تعلیم سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی میں بہت سے مضامین کے شعبے قائم کیے۔ اس بنا پر آپ کو لوگ ''شاہجہان'' کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ

بہت ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ ان کی اس پیشکش کو سن کر میں خاموش رہا اور اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر واپس ڈھاکہ چلا گیا۔

اس وقت کے پاکستان کے صدر ایوب خان صاحب سے چودھری محمد علی صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ دونوں کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں جو سرکاری کے علاوہ گھریلو نوعیت کی بھی تھیں۔ انہوں نے ایک دفعہ ایوب خان صاحب سے کہا میں یونیورسٹی میں آثارِ قدیمہ کا شعبہ کھولنا چاہتا ہوں اور دانی صاحب کو یہاں بلانا چاہتا ہوں۔ ایوب خان نے کہا کہ وہ دانی صاحب کو اچھی طرح سے جانتے ہیں آپ انہیں ضرور یونیورسٹی میں بلائیں۔ پشاور قدیم تاریخ سے مالا مال ہے ان کی خدمات سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ چودھری محمد علی صاحب نے مجھے خط لکھا کہ آپ یہاں آنا چاہتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ صوبہ سرحد میں میرے مضمون (آثارِ قدیمہ) کے لیے بہت مواد ہے۔ یہ علاقہ قدیم تاریخ سے بھرا پڑا ہے۔ اب تک اس علاقے پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ میں نے یہاں جتنا کام کیا، اس کے علاوہ بھی ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ اگر میں یہاں سے اسلام آباد نہ چلا جاتا تو یہ سلسلہ جاری رہتا۔ میں اسلام آباد کیوں گیا یہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ میں نے پشاور جانے کے لیے اپنی رضامندی دے دی اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے استعفیٰ دے دیا اور پشاور جانے کی تیاری شروع کر دی حالانکہ میرے بچے وہاں کے بہترین سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ قربانی دینی پڑتی ہے۔ اپنے مضمون کے تجسس کے شوق نے مجھے پشاور جانے پر مجبور کر دیا۔

ڈھاکہ میں جب میرے شاگردوں کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے بہت شور مچایا کہ وہ مجھے جانے نہیں دیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اس وقت وہاں کے گورنر اعظم خان تھے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے، وہ ان سے جا کر ملے کہ وہ مجھے پشاور یونیورسٹی جانے نہ دیں۔ اعظم خان نے کسی طرح ان طلباء کو سمجھایا مگر وہ تیار نہ تھے۔ اس دوران مجھے پشاور یونیورسٹی سے تقرری کا کاغذ بھی مل گیا۔ میں اپنے ان چاہنے والے شاگردوں کو نہ چھوڑتا اگر مجھے تجسس کا شوق نہ ہوتا۔ میرا ان شاگردوں سے بعد

میں بھی رابطہ رہا۔ ان میں سے آج بہت سے پروفیسر بن چکے ہیں اور بہت سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

اب میں نے پشاور جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ایک آباد گھر کا سامان اتنا تھا کہ اسے مغربی پاکستان لے جانا مشکل تھا۔ میں نے سوائے کپڑوں کے اور ذاتی سامان کے باقی کا سامان کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا۔ گاڑی لے کر آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سب سامان لے جانے کا کرایہ بہت زیادہ ہے' اس لیے بھی سب سامان بیچ دیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سامان لے جانے کا کرایہ دیا جاتا ہے۔ 1962ء میں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈھاکہ کو خیر آباد کہہ کر پشاور یونیورسٹی آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے ڈھاکہ کے دوست احباب اور شاگرد یاد آتے رہے۔ بعد میں میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن ان سب کی یاد مجھے آتی رہتی تھی۔

یہاں میں نے آثارِ قدیمہ کے شعبہ کی بنیاد رکھی۔ شروع میں میں اکیلا ہی کام چلاتا رہا۔ بعد میں فرزند علی درانی' جو کہ ہسٹری میں ایم۔اے تھے' انہیں بطور لیکچرار شعبہ میں ملازم رکھا۔ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس لیے اُن کے آنے سے کام چلانے میں مدد ملی۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہی فرزند درانی بعد میں پشاور یونیورسٹی میں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اب ایم۔اے آرکیالوجی میں باقاعدہ کلاسز کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے جن طلباء نے ایم۔اے میں داخلہ لیا ان میں یہ شاگرد فدا اللہ صحرائی' عبدالرحمٰن' شجاع الملک' کمال الدین' صلاح الدین' سردار محمد' لیاقت حسین بھٹی اور فرید خان تھے۔ پڑھانے کے علاوہ میرا کام اِن شاگردوں کو آثارِ قدیمہ کے مقامات دکھانا اور ان پر کام کرنا تھا' جس کے لیے ان مقامات پر کھدائی کا کام شروع کیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم مردان گئے۔ مردان کے پہاڑی علاقے میں ایک گاؤں سنگھاؤ ہے' میرا یہ سفر اپنے شاگردوں کے ساتھ تھا۔ ایک دن اسی تلاش میں ہم اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ میں نے ایک پتھر کو اٹھا کر غور سے دیکھنا شروع کیا' وہاں ایک لڑکا تھا' جس کا نام مستانہ تھا۔ اس نے کہا کہ آپ کیا تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم پرانے زمانے کے پتھر تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ایک غار دکھاتا ہوں۔ ہم سب

اُس کے ساتھ جب وہاں گئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی ایک پہاڑی پر بہت بڑی غار تھی۔ غار کے باہر باقاعدہ رہائش کی جگہ اور سب ضرورت کی چیزیں مثلاً پکانے کے لیے چولہے تک موجود تھے۔ اس کے علاوہ پتھر کے اوزار اور ہتھیار بھی ملے۔ یہ پتھر کے زمانے کے قدیم ترین آثار تھے۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ میرے اس کام سے پوری دنیا میں میری اور پشاور یونیورسٹی کی پہچان ہوگئی۔ اس پر میں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''سنگھاؤ'' ہے۔ یہاں میرا طریقہ کار یہ تھا کہ خیمے لگا کر اپنے سب شاگردوں کے ساتھ رات بسر کرتے۔ صبح اٹھ کر مختلف ٹولیوں میں کام شروع کر دیتے۔ رات کے وقت اپنی اپنی چارپائیوں سے نیچے نہیں اترتے۔ کیونکہ اس جگہ سانپ تھے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں سیٹی بجاتا اور سب شاگرد گروپ کی صورت میں جمع ہو جاتے۔ میں ہر ایک گروپ کے سپرد کام کرتا۔ وہ سب اس میں مصروف ہو جاتے۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا یہ کھدائی کا کام سال میں دو بار ہوتا۔ ایک دفعہ دسمبر کی چھٹیوں میں اور دوسری بار گرمیوں کی چھٹیوں میں۔ باقی وقت ہم مطالعاتی کام میں مصروف ہو جاتے۔ یہ کام 1962ء میں کیا گیا۔

''سنگھاؤ'' میں جو پتھر کے زمانے کی چیزیں ملیں یہ پتھر کے زمانے کے قدیم ترین آثار تھے۔ یہ چالیس (40) ہزار سال پرانے تھے۔ اس زمانے کے جو آثار ملے وہ پشاور یونیورسٹی کے عجائب گھر میں ہیں۔ پتھر کے زمانے کے یہ آثار صوبہ سرحد میں انسانی وجود کی سب سے پہلی شہادت ہے۔ اس زمانے کے لوگوں نے ابھی دھات کا استعمال نہیں سیکھا تھا۔ اب ریسرچ کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ اس طرح کی ریسرچ (تحقیقی کام) کے لیے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ آثار قدیمہ سے باقاعدہ ایک (Bulletin) نکالا جس کا نام Ancient Pakistan رکھا جو ابھی تک جاری ہے۔

اس کامیابی کے بعد میرا تجسس بڑھتا گیا۔ اب دوسرا کام ''پش کلازتی'' میں کھدائی تھی۔ یہ چارسدہ کے قریب ایک بہت بڑا ثقافتی ٹیلہ تھا جو ''شیخان ڈھیری'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہاں پر میں نے دو دفعہ کھدائی کروائی اور بہت سے نوادرات نکالے جو پشاور یونیورسٹی کے میوزیم میں موجود ہیں۔ یہاں پر کھدائی کرتے ہوئے ایک دن ایک بہت قدیم مورتی ملی تھی جس

کا نام "ہریتی" ہے۔اس دن ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی اور ہماری ساری محنت کا صلہ اس دن مل گیا۔ چارسدہ میں میرا کام دیکھنے کے لیے خان عبدالولی خان بھی آئے تھے جس سے بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔

1963ء میں "تیمر گڑھا" (دیر) میں کھدائی کا کام شروع کیا۔ تیمر گڑھا پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں ہے۔ یہاں میں اپنی فیملی کے ساتھ گیا۔ میرے ہمراہ شریف صاحب تھے جو محکمہ آثار قدیمہ لاہور میں تھے۔ وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے گئے تھے۔ اس وقت وہاں رہائش کے لیے دو مکان تھے۔ ایک سول سرجن کا تھا اور دوسرا اسٹاف کا تھا۔ چونکہ اس وقت کوئی ڈاکٹر آیا نہیں تھا اس لیے ہمیں وہ مکان رہنے کے لیے مل گئے۔ یہ مکان اوپر پہاڑی پر بنے ہوئے تھے اور نیچے دریا بہتے ہوئے نظر آتا تھا۔ نہایت خوبصورت منظر تھا۔ کھدائی کا کام نیچے ہموار زمین پر ہو رہا تھا اور اس کے پاس ہی باقی عملہ خیموں میں رہتا تھا۔ وہاں پر تقریباً دو ماہ تک رہے۔ اس جگہ آریاؤں کی بہت ساری قبریں کھدائی میں ملیں اور دیکھا گیا کہ مردے کے ساتھ مٹی کے برتن دفن کیے گئے تھے۔ ان برتنوں میں اناج بھی ملا۔ ایک مردے کے پیٹ میں تیر چبھا ہوا تھا۔ یہاں کھدائی کا کام مکمل کیا اور پشاور آیا اور ایک کتاب "تیمر گڑھا" کے نام سے لکھی جس میں آریاؤں کی تہذیب کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔

اس کے بعد پھر شیخان ڈھیری گئے اور وہاں سے سوات کے راستے "تھانہ" Thana گئے۔ وہاں ڈاکٹر منور خان کے گاؤں گئے۔ ڈاکٹر منور خان پشاور یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے سربراہ تھے۔ میرے ان کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ وہاں کھانے کے بعد گاؤں والوں نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ تو ڈاکٹر منور نے بتایا کہ یہ پشاور یونیورسٹی میں آثارِ قدیمہ کے ماہر ہیں اور ان کا نام پروفیسر احمد حسن دانی ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک نے پوچھا کہ آپ کافروں کی قبریں بھی دیکھتے ہیں تو میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ کافروں کی قبریں ہیں تو اس نے بتایا کہ مسلمانوں کی قبروں کا رخ شمال جنوب ہوتا ہے اور کافروں کی قبریں مشرق مغرب کی طرف ہوتی ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔ اس کام کے لیے میں نے اسے 100 روپے دیئے، انعام کے طور پر۔ اگلے دن اس نے مجھے وہ قبریں دکھائیں۔ قبر کو دیکھ کر میں

نے کہا کہ یہ واقعی کافر کی قبر ہے۔ میں نے ایک قبر کو کھدوایا تو اس میں مردے کے علاوہ برتن پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر منور خان کے ساتھ میں اس رستے پر بھی گیا جس رستے سے سکندر اعظم اس علاقہ میں آیا تھا۔ تھانہ کے بعد گندھارا آرٹ کو سمجھنے کے لیے ضلع دیر (Dir) کے مختلف مقامات پر کھدائی کا کام شروع کیا۔ ان میں زیادہ مشہور جگہیں ''مرم کوٹ''، ''اندان ڈھیری''، ''بلمنٹ'' ہیں۔ ان جگہوں سے جو ثقافتی آثار ملے وہ ''چکدرہ'' کے میوزیم میں ہیں۔ یہ بہت بڑا پراجیکٹ تھا، اس سے بہت سے تاریخی نتائج برآمد ہوئے جس سے تحقیقی کام میں بہت مدد ملی۔ اس میوزیم کو قائم کرنے میں میرا بہت بڑا حصہ تھا۔ میں نے بی۔اے قریشی جو اس زمانے میں مغربی پاکستان کے ایڈیشنل چیف سیکرٹری تھے ان کو آمادہ کیا یہاں مجسّموں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ اس کے لیے ایک میوزیم بنایا جاسکتا ہے لہٰذا ''چکدرہ'' کے مقام پر ایک میوزیم کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر قریشی صاحب نے میوزیم قائم کرنے کے لیے رقم فراہم کردی۔

''دیر'' میں ہی میں نے ایک اور ریسرچ کا کام شروع کردیا جسے میں نے ''گندھارا گریو کلچر'' "Gandhara Grave Culthre" کا نام دیا۔ یہ نام میں نے اس لیے دیا کہ یہ تمام کے تمام ثقافتی آثار قبروں سے ملے تھے۔ ان قبروں کا تعلق 800 سے 1500 قبل از مسیح کے زمانے سے تھا۔ ان قبروں کے آثار سے اس زمانے کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملی۔ یہ آثار پشاور یونیورسٹی کے عجائب گھر میں بھی موجود ہیں۔ اس طرح کے آثار اٹلی کے آثار قدیم کے ماہرین کو بھی سوات میں ملے ہیں۔ جو اَب ''سیدوشریف'' کے میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان آثار کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان کے علاوہ اُس زمانے کے تاریخی شواہد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ اس پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ''چکدرہ'' ہے یہاں ایک اہم بات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سوات میں کھدائی کے دوران اٹلی کے ماہر آثار قدیمہ جن کا نام ''یُوچی'' "Yuchi" تھا۔ وہ کھدائی کے دوران ملنے والا سونے کا ایک پیالہ اور دیگر نوادرات چھپا کر لے گیا تھا۔

صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کی تاریخ سمجھنے کے لیے میں نے ایک اور پراجیکٹ پر کام شروع کیا۔ یہ یاد رہے کہ ان تمام پراجیکٹ میں میرے سب شاگرد میرے ساتھ ہوتے تھے۔

اس پراجیکٹ کا مرکز ڈیرہ اسمٰعیل خان (D.I.K) کا میرانی علاقہ تھا۔ اس علاقے کا سروے کرنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا یہاں بہت پرانی تہذیب کے آثار مدفون ہیں لہٰذا میں نے کھدائی کا کام شروع کروا دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایسے آثار ڈھونڈ نکالے جن کا تعلق تین (3) سے چار (4) ہزار سال قبل از مسیح تھا۔ اس طرح کے آثار کچھ عرصہ قبل صوبہ سندھ کے مقام کوٹ ڈیجی (Kot-Digi) سے بھی ملے تھے۔ میری اس دریافت سے پہلے ان کا تسلسل صوبہ سرحد میں ناپید تھا۔ صوبہ سرحد میں اس طرف کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ ان آثارِ قدیمہ کو کوٹ ڈیجی (Kot-Digi) کا کلچر کہتے ہیں۔ کھدائی کے اس کام میں کوٹ ڈیجی کے کلچر کے نیچے مجھے اس سے بھی زیادہ قدیم آثار ملے جن کا تعلق نئے حجری دور Neolithie Age سے بنتا ہے۔ یہ آثارِ بھی صوبہ سرحد میں پہلی دفعہ ملے تھے۔ یہاں 1964ء میں کام شروع کیا تھا۔ گومل ویلی میں کوٹ اللہ داد گئے۔ یہاں سب سے پہلے بدھ کی ڈھیری دریافت کی یہاں آریاؤں کی دو قبریں بھی دریافت کیں یہاں 1964ء-1967ء تک کھدائی کا کام ہوتا رہا اور کانسی (Bronze) کے زمانے کے آثار بھی ملے۔ Sir Aural Stein کا تعلق برطانیہ سے تھا انہوں نے کہہ دیا تھا کہ سرحد میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر میں نے ان کی اس بات کو بھی غلط ثابت کر دکھایا۔ یہاں سے جو چیزیں دریافت ہوئیں وہ پشاور یونیورسٹی کے میوزیم میں رکھی گئی ہیں۔ گومل ویلی Gomal Valley کے نام سے میں نے ایک کتاب بھی لکھی یہاں سے مجھے Tera Kota اور Bronze کی چیزیں ملیں۔

1966ء میں ہم ایک بار کابل کے تفریحی دورے پر گئے۔ یہ میرا ذاتی دورہ تھا۔ وہاں پر ہمارا قیام سید رسول رسا صاحب کے گھر رہا۔ رسا صاحب کابل میں ایجوکیشن کے اتاچی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہ پروفیسر لالہ عبدالرحیم نیازی صاحب کے داماد تھے۔ نیازی صاحب لالہ نیازی کے نام سے پشاور کے حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور پشتو کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کو تصوف پر بھی عبور تھا۔ روحانیت میں ان کا ایک مقام تھا۔ سید رسول رسا صاحب کے ساتھ ان کا صرف ایک بیٹا رہتا تھا۔ ان کی باقی فیملی جس میں ان کی بیوی، ایک بیٹا اور بیٹی شامل تھے، پشاور میں قیام پذیر تھے اور وہ ہمارے ہمسایہ تھے۔ ہم نے ان کے بیٹے

کے ساتھ کابل کی سیر کی اور مختلف مقامات دیکھنے گئے جس میں مغل بادشاہ بابر کا مقبرہ بھی شامل تھا۔ اس طرح پشاور کی گرمی سے دور کابل کے خوبصورت پُر فضا مقام پر قیام کے بعد ہم واپس پشاور آ گئے۔

میں اپنی فیملی کے ساتھ خیبر پختونخوا کے مختلف مقامات پر تفریح کے لیے جاتا تھا۔ اس دوران بھی تاریخ میرے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی۔ ہم جس طرف بھی جاتے میرا دھیان زمین کی طرف ہوتا اور میں پتھر یا مٹی کے برتن کے ٹکڑے چنتا کہ شائد یہ قدیم زمانے کے نکل آ ئیں۔

1969ء میں آسٹریلیا کی کینبرا یونیورسٹی میں میں چار ماہ تک Visiting Professor رہا۔ وہاں میرا مقام یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ پہلے دو مہینے میں اکیلا رہا پھر بعد کے دو مہینے صفیہ دانی بھی میرے ساتھ رہیں۔ فوزیہ کو ہم نے ہاسٹل میں داخل کروا دیا تھا۔ بڑا بیٹا لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ باقی دونوں چھوٹے بیٹے مسز صفیہ حسن پرنسپل ڈگری کالج پشاور یونیورسٹی کے گھر رہائش پذیر ہوئے۔ مسز صفیہ حسن کو وائس چانسلر چودھری محمد علی صاحب نے اس کالج کی پرنسپل مقرر کیا۔ آپ کشمیر سے سیدھا پشاور آئی تھیں۔ ان کی انتھک محنت سے آج یہ کالج جناح کالج پشاور کے نام سے صوبہ خیبر پختونخوا میں نمایاں مقام حاصل کر چکا ہے۔

پشاور آ کر میرے ہندوستان کے چکر بند ہو گئے۔ ایک تو بچے بڑی جماعت میں پہنچ گئے تھے اور دوسری بات یہ کہ پشاور سے بسنہ کا سفر اتنا آسان نہیں تھا اس لیے آسٹریلیا سے واپسی پر میں اور میری بیگم ہندوستان گئے اور بسنہ میں اپنے بہن بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں سے ملتے ہوئے واپس پشاور پہنچے۔

پشاور میں میرے اور میرے عملے کی کھدائی کے کام سے اور تحقیقات سے صوبہ خیبر پختونخوا کی تاریخ کے کئی گمشدہ اوراق ایک دفعہ پھر منظر عام پر آ گئے۔ یہ تاریخ کا دور جو پہلے محض چند صدیوں کے حالات تک محدود تھا اب چار ہزار سال قبل از مسیح سے لے کر ایک ہزار سال عیسوی تک پھیل گیا اور اس کے خدوخال نمایاں ہو گئے۔ کھدائی سے حاصل کردہ مواد اور معلومات

کولوگوں تک پہنچانے کے لیے میں نے جو جرنل نکالا تھا اس کی اشاعت بدستور جاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آرکیالوجی میں دلچسپی رکھنے والے افراد کی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحقیق و تفتیش کا جو پودا میں نے 1962ء میں لگایا تھا جس کی میں نے 9 سال تک آبیاری کی اب 50 سال کا تن آور درخت بن گیا ہے جس کے پھل سے بے شمار لوگ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔محکمہ آثارقدیمہ کے لیے یہ ریسرچ جرنل میرا ایک انمول تحفہ ہے۔میرا قائم کیا ہوا ڈیپارٹمنٹ پشاور یونیورسٹی کا شاید واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کے تمام کے تمام اساتذہ PHD کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں۔اس تھوڑے عرصے میں میں نے پشاور میں جتنا نام پیدا کرلیا تھا اس سے کچھ لوگ مجھ سے حسد کرنے لگے اور کچھ مجھے حد سے زیادہ پسند کرتے تھے۔

1971ء میں اسلام آباد یونیورسٹی (ان دنوں قائداعظم یونیورسٹی کو اسلام آباد یونیورسٹی کہتے تھے) کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب اور صاحبزادہ حسن شاہ صاحب نے مجھے اسلام آباد یونیورسٹی میں ملازمت پیش کی۔میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا۔میں نے انجینئرنگ کالج پشاور یونیورسٹی کے پرنسپل عبیداللہ درانی صاحب سے مشورہ کیا' انہوں نے کہا کہ فی الحال میں ایک سال کی چھٹی لے کر اسلام آباد چلا جاؤں۔بعد میں حالات کے مطابق اس کا فیصلہ کرنا کہ آئندہ کے لیے میرا لائحہ عمل کیا ہوگا۔چنانچہ ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے میں اسلام آباد چلا گیا۔میں یہاں عبیداللہ درانی صاحب کا مختصر سا تعارف پیش کرنا چاہتا ہوں۔آپ کا تعلق مدراس (ہندوستان) سے تھا۔علی گڑھ کالج سے بی-ایس-سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن تشریف لے گئے۔وہاں شیفیلڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔کامیاب ہونے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کرلی۔پشاور میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب تھے۔وہ قابل لوگوں کو تلاش کرکے یونیورسٹی میں ملازمت کی دعوت دیتے۔ان کے کہنے پر آپ علی گڑھ سے پشاور آگئے اور انجینئرنگ کالج پشاور میں بطور پرنسپل تعینات کردیئے گئے۔

ایک سال تک میرے اہل خانہ پشاور ہی میں رہے کیونکہ میرے دو بچے وہاں زیر تعلیم تھے۔اس دوران میں راولپنڈی سیٹلائٹ ٹاؤن میں کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔میرا گھر اسلام

آباد میں F-8 میں بن رہا تھا بعد میں ہم سب وہاں رہنے لگے۔ اس طرح پشاور کا یہ دور ختم ہوا اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی پشاور کو خیرباد کہنا پڑا۔ اگر میں مزید وہاں رہتا تو ریسرچ کے کاموں کو جاری رکھتا۔ بہرحال جو اللہ کو منظور ہو وہی ہوتا ہے۔ پشاور کو خدا حافظ کہہ کر اسلام آباد کی زندگی کا آغاز کرتا ہوں اور اگلا سفر اسلام آباد سے شروع ہوگا۔

اسلام آباد کا دور

1971ء میں اسلام آباد یونیورسٹی میں مجھے سوشل سائنس کے شعبہ میں ڈین بنایا گیا اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اساتذہ رکھ لیے اور شاگرد بھی آ گئے۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن میرا کھدائی کا کام بند ہو گیا۔ پانچ سال تک میں ڈین رہا۔ پھر میں نے یہ انتظامی کام چھوڑ دیا اور اپنا وقت تحقیقی کام میں لگا دیا۔

1974ء میں امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی فلاڈیلفیا میں مجھے دو ماہ کے لیے Visting Professor بنایا گیا۔ وہاں پر میری ملاقات اپنے ہونے والے داماد سے ہوئی۔

دسمبر 1976ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی پیدائش کا سوسالہ جشن منایا گیا جس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس اسلام آباد یونیورسٹی میں منعقد ہوئی۔ اس کے عوض اس یونیورسٹی کا نام بدل کر قائداعظم یونیورسٹی رکھا گیا۔ اس کانفرنس کا سارا کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لیے ایک باب بنایا گیا جس کا نقشہ میں نے بنایا۔ مجھے ایک اور بھی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں پینتالیس ممالک سے نمائندے آئے تھے جنہوں نے قائداعظم کے بارے میں پاکستان تحریک اور پاکستان کے مستقبل کے بارے میں تقریریں کیں۔ ان سب کو اکٹھا کرنا اور کتابی شکل دینا میرا کام تھا۔ اس کتاب کی دو جلدیں چھپیں جن کے نام ہیں World scholars on Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah اور Quaid-e-Azam and Pakistan۔

1979ء میں پروفیسر Jettmar جو کہ جرمنی میں ہائیڈلبرگ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، ان کے کہنے پر ان کے ہمراہ شمالی علاقہ جات گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہاں پر ایک کتبہ ہے جسے

میں نے پڑھنا ہے۔ یہ کسی قدیم زمانہ کی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ میں ان کے ساتھ چلاس گیا۔ وہاں پر میں نے اور بہت سارے کتبے ڈھونڈ نکالے۔ میں نے پروفیسر Jettmar سے کہا آپ تو ایک کتبہ کے بارے میں کہہ کر لائے تھے یہاں تو بہت سارے مل گئے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اسے مکمل کرنے کے لیے تو ایک نئی اسکیم بنانی ہوگی۔ اتنے بہت سے کتبے ایک دو دن میں نہیں پڑھے جاسکتے۔ اس کے لیے ہم منسٹری آف کلچر میں منسٹر (وزیر) سے ملے اور کہا کہ شمالی علاقے پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ آپ پروفیسر Jettmar کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیں۔ ہمیں پیسے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کام کے تمام اخراجات حکومت جرمنی پورا کرے گی۔ اجازت مل گئی اور ہم نے پانچ سال کا پروگرام بنایا۔ اس میں چلاس' گلگت اور ہنزہ میں کام شروع کیا۔ وہاں کے کتبوں کو میں نے پڑھا اور ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے History of Northern Area۔ یہ کتاب اس علاقے کے بارے میں پہلی تحقیقی کتاب ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب ہنزہ کے بارے میں لکھی۔ وہاں پر جتنے پرانے کتبے ملے اسے پڑھ کر اس کی بنیاد پر ہنزہ کی تاریخ مرتب کی۔ اس طرح شمالی علاقہ جات کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں پوری دنیا کو پہلی مرتبہ علم ہوا۔ اس دریافت کی بنیاد پر حکومت فرانس نے مجھے Palmes Academiques سے نوازا۔

1978ء میں مجھے اپنی بیگم کے ساتھ حج کرنے کی سعادت ملی۔ وہاں کا ماحول بالکل مختلف ہے اور وہاں جاکر جو کیفیت محسوس ہوتی ہے وہ اسی کو معلوم ہے جو مکہ مدینہ سے ہو کر آتا ہے۔ 1980ء میں دوبارہ اللہ کے گھر جانے کا اتفاق ہوا لیکن اس مرتبہ صرف عمرہ کیا۔ اس موقع پر بھی میری بیگم میرے ساتھ تھی۔

20 جون 1980ء کو میں قائداعظم یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہو گیا لیکن یونیورسٹی والوں نے مجھے ساتھ ہی Professor Emeritus بنا دیا۔ یونیورسٹی میں میرا دفتر اسی طرح قائم رہا اور میرے پاس Phd کرنے کے لیے شاگرد آتے رہے۔ میں نے گھر میں بھی ایک مطالعہ کا کمرہ بنا لیا تھا جو شاگردوں کے لیے اور دوسرے علم حاصل کرنے والوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ میرا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا تھا کیونکہ مجھے کتابیں خریدنے کا بہت شوق تھا اور مجھے تحفے کے طور پر بھی دوسرے پروفیسر حضرات کتابیں دیتے۔ جب بھی میں کسی کانفرنس سے کسی بیرونی ملک سے واپس

آتا تو میرا سامان کا وزن کتابوں کا ہوتا جس سے میری بیگم کبھی کبھی تنگ بھی آ جاتیں کیونکہ انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

اسلام آباد سے ہندوستان اور بسنہ کا چکر کم ہوتا گیا۔ 1981ء میں میرے بڑے بھائی پاکستان آئے اور سب رشتہ داروں سے ملے۔ لاہور، ملتان اور کراچی بھی گئے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ یہاں پر سب اتنے خوشحال ہیں۔ 1982ء میں دہلی میں میری ایک کانفرنس تھی۔ میں اپنی بیگم، بیٹی، داماد اور ان کے دو بچوں کو ہمراہ لے گیا۔ ان سب کو میں نے دہلی اور آگرہ کی سیر کرائی اور جہاں جہاں میں نے کام کیا تھا وہ بھی دکھایا۔ ہم بسنہ بھی گئے اور سب رشتہ داروں سے ملے۔ وہاں کے حالات دیکھ کر انہوں نے بہت شکر کیا کہ پاکستان بنا اور وہ پاکستان میں رہتے ہیں۔

ریٹائرڈ ہونے کے بعد میں Unesco سے وابستہ رہا۔ پاکستان کا نمائندہ تھا اور جب بھی کوئی میٹنگ ہوتی مجھے پیرس جانا پڑتا۔ میں نے ایک تجویز پیش کی کہ جو قدیم راستہ پہاڑوں سے گزرتے ہوئے روس سے لے کر برصغیر تک آتا تھا اسے پھر سے استعمال کیا جائے۔ اس تجویز پر روس اور فرانس کے تاریخ دان اور ماہر آثار قدیمہ حیران اور پریشان ہوئے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ لیکن میں نے انہیں تسلی دی کہ ممکن ہے آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ اس کے لیے مجھے Scientific Leader بنایا گیا۔ روس کے تعلیم دان احمد علی اسکارو (Askarov) کو Co-Leader اور پیرس کے Mr. Doudou Diene کو Co-Ordinator بنایا گیا۔ ہم کتنے مہینے خط و کتابت کرتے رہے اور ملتے رہے اور آخرکار ہمارا پروگرام بن گیا۔ یہ مہم دو ماہ کی تھی۔ 19 اپریل سے 18 جون 1991ء تک جس میں مختلف ممالک کے عالم نمائندہ شامل تھے۔ اس کے مطابق ترکمانستان، ازبکستان، تاجکستان، خرگستان اور کرغزستان میں ہمیں سفر کرنا تھا۔ سیمینار بھی ہوتے رہے اور یہاں کے قدیمی تہذیب سے ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس مہم سے پوری دنیا کو یہاں کے رہنے سہنے کے طریقہ کے بارے میں علم ہوگیا اور یہ بھی پتہ چلا کہ پاکستان کی تہذیب وسط ایشیاء کی تہذیب سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس کے عویض مجھے 1991ء میں بخارا کا اعزازی باشندہ بنایا اور تاجکستان میں پیوند سوسائٹی کا اعزازی ممبر بنایا۔ 1997ء میں یونیسکو نے Aristotle Silver Medal بھی دیا۔ اللہ کے فضل سے مجھے اور بھی بیرونی ممالک نے اعزاز سے نوازا۔

1994 Knight commander Government of Italy

1996 Order of the Merit Government of Germany

1998 Legion d honneur President of the French Republic

حکومت پاکستان نے بھی مجھے 1969ء میں ستارہ امتیاز۔ 1992ء میں اعزاز کمال اور 2000ء میں ہلال امتیاز سے نوازا۔

1992ء سے 1996ء تک منسٹری آف کلچر کے آثار قدیمہ کے حوالے سے مجھے ایڈوائزر بنایا گیا۔ اس میں میری یہی کوشش رہی کہ ہمارے ملک میں جتنی پرانی یادگار عمارتیں ہیں انہیں کسی طرح محفوظ رکھا جائے اور ہمارے قاس قدیم تہذیب کا جتنا ذخیرہ ہے انہیں میوزیم میں رکھا جائے تاکہ محفوظ رہیں اور لوگ انہیں دیکھ سکیں۔

1994ء سے 1998ء تک مجھے نیشنل فنڈ فار کلچرل ہیریٹیج اسلام آباد کا چیئرمین بنایا گیا۔ اس دوران میں پنجاب اور خیبر پختونخوا کی قدیم عمارتیں اور کھنڈرات دکھانے کے لیے کارواں لے کر جاتا رہا جس میں نہ صرف پاکستانی حضرات شامل ہوئے بلکہ مختلف ممالک کے سفیر اور ان کا عملہ بھی شامل ہوئے۔ اس میں مرد، عورتیں اور بچے بھی جاتے رہے اور کیونکہ حکومت کی طرف سے میرے مشورہ کے ساتھ سارا انتظام ہوتا اس لیے یہ کارواں بڑے کامیاب رہے۔ سب ابھی تک ان کو یاد کرتے ہیں۔

1997ء میں مجھے ٹیکسلا انسٹیٹیوٹ آف ایشین سویلائزیشن کا اعزازی ڈائریکٹر بنایا گیا۔ ٹیکسلا میوزیم بہت پرانا بنا ہوا تھا اور اسے اب ایک نئی شکل دے دی۔ ٹیکسلا ایک بہت قدیم شہر ہے جو کہ اپنے وقت پر اس علاقہ کا دارالحکومت تھا۔ میری دلی خواہش ہے کہ یہاں ایک یونیورسٹی بنائی جائے لیکن یہ خواہش ابھی تک پوری نہ ہو سکی۔

میرا بڑا بیٹا انیس احمد اپنے کام کے سلسلے میں بیرون ممالک میں رہتا رہا۔ وہ ہر جگہ مجھے بلاتا تھا اور میں بھی اسے ملنے چلا جاتا۔ میں اپنی بیگم کے ساتھ اس کے پاس کھٹمنڈو (نیپال) گئے جہاں اس نے ہمیں بہت سیر کرائی۔ 2000ء میں واشنگٹن (امریکہ) گئے۔ واشنگٹن سے ہمیں ہمارا بیٹا Niagra Falls لے کر گیا لیکن اس موقع پر زیادہ سیر نہیں ہو سکی کیونکہ میری صحت

اجازت نہیں دے رہی تھی۔ انیس نے پہلے ہی ڈاکٹر سے وقت لے رکھا تھا اور جب مجھے اس کے پاس لے گیا تو اس نے فوراً بائی پاس آپریشن کروانے کو کہا جو کہ میں نے کروایا۔ اللہ کی مہربانی سے میں جلدی ٹھیک ہو گیا اور تقریباً چھ ہفتے میں اسلام آباد واپس آ گیا۔

مجھے کینیڈا' فرانس' جرمنی' اٹلی' ترکی' ایران' عراق' فلپائن اور چین جانے کا موقع ملا۔ یہ سب جگہ مجھے سیمینار یا کانفرنس کے سلسلہ میں بلایا جاتا۔ گھومنے پھرنے کا مجھے بے حد شوق رہا ہے اور نئی نئی جگہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی لیکن اپنے گھر آنے کی زیادہ خوشی ہوتی۔

قائداعظم یونیورسٹی میں میرے شاگرد نہ صرف Phd کر رہے تھے بلکہ ہندی سیکھنے بھی آتے تھے۔ ان کو بڑا شوق تھا کہ میرے ساتھ ہندوستان جائیں اور میں انہیں دہلی اور آگرہ دکھانا چاہتا تھا۔ 2003ء میں یونیورسٹی کی طرف سے اجازت ملی کہ میں شاگردوں کو ہندوستان لے کر جا سکتا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیگم اور میرا نواسہ بھی گئے تھے۔ میں سب کو دہلی اور آگرہ کی تاریخی عمارتیں دکھانے لے گیا اور ساتھ ساتھ ان کی تاریخ بھی بتاتا رہا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اپنی آنکھوں سے ساری تاریخی جگہ دیکھ کر اچھی طرح سمجھ آئی۔ دہلی سے چند دنوں کے لیے میری بیگم' میں اور میرا نواسہ بسنہ گئے۔ یہ میرا آخری سفر تھا بسنہ کے لیے۔ اب میرے ساتھی بھی بہت کم رہ گئے تھے۔ میرے بڑے بھائی فوت ہو چکے تھے۔ ان کے بچے تھے۔ میری ایک بہن تھی اور بیگم کی بہنیں۔ کئی کزنز بھی تھے لیکن پہلے والی بات نہیں رہی۔

میرے گھر میں ڈاکٹر رضیہ' زیڈ اے قریشی اور بریگیڈیئر نعیم اکثر آتے تھے اور ایک دن بیٹھے ہوئے باتیں کرتے کرتے ایک سوسائٹی بنانے کا خیال آیا۔ اس کے نام کی تجویز پیش کی۔ ''سوسائٹی فار ایشین سویلائزیشن''۔ سب کو یہ نام پسند آیا اور یہ نام رکھا گیا۔ اس کی میٹنگ اکثر میرے گھر میں ہوتی ہے جو سوسائٹی کے باقی ممبران ہیں وہ بخوشی میرے پاس گھر پر آتے اور مشورہ لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح اس سوسائٹی کا سلسلہ چل پڑا۔

2006ء میں میری بڑی نواسی کی شادی ہوئی اور 2008ء میں چھوٹی نواسی کی۔ دونوں

کی شادی لاہور میں ہوئی اور خوشی کی بات یہ ہے کہ میں دونوں میں شامل ہوسکا۔

اب میں زیادہ کام اپنے گھر میں کرتا ہوں۔ ہفتہ میں ایک دن یونیورسٹی کا چکر لگاتا ہوں تاکہ اپنے شاگردوں کی رہنمائی کرسکوں۔ گھر میں سوسائٹی کا کام بھی کرتا ہوں۔ اس سے میری اچھی مصروفیت رہتی ہے اور لوگ میری رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

O-----O-----O

Rs. 400.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-2460-8
ISBN-13: 978-969-35-2460-4